Deevan Zaook

دیوانِ ذوق

یعنی

ملکُ الشعراء خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام
جس قدر بہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانح عمری

مؤلفۂ

شمسُ العلماء مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

حسب فرمایش

آغا محمد طاہر مینجر آزاد بک ڈپو

مولوی عبدالحق صاحب کے مطبع رفاہ عام لاہور میں طبع ہوا

سنہ ۱۹۲۲ء
۱۳۴۰

قیمت درجہ دوم

درجہ اول

دربارِ اکبری

ایک نمونہ ہے قدرت کی قلمکاری کا جسمیں جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ
اور اسکے نورتن (امرائے جلیل القدر) کے دلچسپ حالات اس خوبی سے قلمبند ... کہ ناظر
عش عش کرجاتا ہے۔ اور مورخانہ شان کے ساتھ ساتھ اردو علم ادب ایسی ... ی مثال دکھانے
سے قاصر ہے۔ اُس عہد کے واقعات۔ آئین۔ اہل قلم۔ اہل سیف کے مختلف مرقعے۔ دُنیا کے
جداگانہ مذاہب اور تخیلات کے گوناگوں چربے اپنے منہ سے بولتی تصویریں ہیں۔ جو
موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے معلومات کا ذخیرہ ہیں یا دوسرے لفظوں میں

دربارِ اکبری

ایک ایسی دلکش اور جامع تاریخ ہے جسمیں عام فہم محاورات کے دریا بہا ... ئے ہیں
اور ٹکسالی اُردو کے جاننے والے چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ عدالت اور انصا
کی رودادیں۔ جُرات اور تہوّر کے کارنامے۔ سیاسی نکات قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ حاصل
کرکے ایک جگہ جمع کئے ہیں۔ جنگی آراستگی میں مصنف نے راتیں کالی کی ہیں اور دن گنوائے ہیں

ہزار میں سے ایک اور خرمن میں سے دانہ

شہنشاہ اکبر کا خاص کیرکٹر۔ اور اسکی رنگا رنگ شانیں۔ نورتن کے حا... اور انکی
گوناگوں جامہ زیبیاں۔ رزم۔ بزم۔ شادی وغم۔ سیر وشکار۔ خلو... جلوت
دربار دُربار۔ کوہ وبیابان۔ دشت ودریا۔ صبح وشام۔ غرض جہ... جس چیز کو
دکھایا ہے لفظ نہیں جو اس کی حقیقی تعریف کی جاوے اور زبان نہیں جو اُن
مورخانہ حقائق کا اعادہ کرسکے۔ اس پر ۸۵۰ صفحہ ولایتی کاغذ ۲۲×۲۹ تقطیع

قیمت پانچروپے (صہ) بمعہ فوٹو حضرت آزاد

المشـــــــتہر

آغا محمد طاہر مینجر آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ علم معنی کی روحیں ہیں کہ الفاظ کی دُنیا میں اُتری تھیں۔ ذوق و شوق کے وعدے تھے کہ دلوں کو آگاہ کرینگے۔ اُستاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے۔ والد میرے شہیدِ آرزو ہوئے۔ میں بُڈھا ہوگیا۔ اب خطر ہے کہ امانت رہے۔ اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔ ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوانِ مُروّجہ میں کچھ چھپے۔ اور اُن کی زبان سے کبھی کچھ ... سے بھی کچھ سنے۔ پھٹے پُرانے مُسوّدے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ و... م کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں۔ کہ حاضر غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا مٹے حرفوں کا اُجالنا اُس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا۔ حالتوں کا تصوّر باندھنا۔ بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شاملِ حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں۔ اور دن اندھیرے ہوگئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔ پہلے مرحوم و مغفور کا حال سوانح عمری کے طور پر لکھتا ہوں۔ اور جس جس موقع پر ... کی صورت خاص پیش آئی۔ یا کوئی نظم کسی تقریب خاص سے لکھی گئی۔ یا کوئی لطیفہ قابلِ آگاہی شگفتہ ہوا۔ وہ بھی باجا ... کرتا ہوں۔ والد مرحوم کا دیوان کا آغاز تحصیل ساتھ

ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے۔ ساتھ بڑھے۔ ہر معرکہ میں شریک حال رہے۔ اور تھوڑے فاصلہ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھکر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اس طرح سُنے ہیں گویا سامنے گذرے ہیں ❋

تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے۔ مگر کیا کروں جی بھی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اِس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعتکاری کی کل ہیں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا۔ اسی واسطے میں لکھونگا اور سب کچھ لکھونگا۔ جو بات سلسلۂ حالات میں مسلسل ہوسکیگی ایک حرف نہ چھوڑونگا ❋

خاندان

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے اُنہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علیخاں نے اُنہیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھکر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے ❋

سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے

۱۱ ذیحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہوکر چمکا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلہ کے اکثر لڑکے اُنہی کے پاس پڑھتے تھے اِنہیں بھی وہیں بٹھا دیا ❋

تعلیم و تربیت

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوق تخلص کرتے تھے[ف]۔ اگلے وقتوں کے

ف نمونہ کلام یہ ہے :- مزا انگور کا ہے رنگترے میں ❋ عسل زنبور کا ہے رنگترے میں
ہیں اشعار ہلالی ہکی پھانکیں ❋ یہ مضمون مزے کا ہے رنگترے میں ❋ نہیں ہے کی پھانکیں ان کی زہرا ❋ یہ لشکر نور کا ہے رنگترے میں
ہے گلگوں جسم باجرا [illegible] ❋ [illegible] رنگترے میں ❋ [illegible] ہے شوق ❋ دل اُن کی جو رکا ہے رنگترے میں

لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّہ کے شوقین نوجوان دلوں کے اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جاتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُنکے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دُعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے ایک دن

پہلے دو شعر

خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں۔ اُس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں ہو جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ اُنہیں کبھی اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے ؛

ابتدائی مشق

اسی محلّہ میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سِن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلّص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا ذہن بھی تیزی اور برّاقی میں لاجواب تھا۔ اُنہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے۔ اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے ؛

بقیہ نوٹ

لکھا ہوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردہ پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردہ پر

کہ نوک مژگاں چشم ستمگر آ کے جگر میں گھوپ چلی — آہ کی ہمدم ساتھ ادھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی

وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوق جنوں نے کل دن کو — آج وہ آئے پاس مرے جب ڈیڑھ پہر کی توپ چلی

فاقے مست عدوے بد ایسا ہی چھٹی کا رجا ہے — نانی جس کی آئی چھٹی میں دھوم سے لے کر گھی کھچڑی

شیخ بگھارے شیخی اپنی مفت کے لقمے کھاتا ہے — وہ ملیدا کھاتے ہیں یا مست قلندر گھی کھچڑی

شاہ نصیر مرحوم کی شاگردی

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے اُنہیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُنکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

اسے عطائے الٰہی کہنا چاہئے کہ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا میاں عبدالرزاق ایک فاضل اُسی محلہ میں صاحب تدریس تھے۔ اُن کے درس میں جاکر شامل ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور کئی برس تک دونو کی تعلیم ایک اُستاد کے دامن شفقت میں پلتی رہی۔ نیکی کی بنیاد ہمیشہ استقلال پر ہوتی ہے۔ اوّل کا رابطہ اخیر دم تک قائم رہا۔ یہ بات اب سگے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوتی۔

سلسلۂ اصلاح جاری تھے مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہدیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ کبھی بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو برّاقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انہیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل مشکل طرحیں کرتے تھے اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض کہ اُن سے اور شیخ مرحوم سے مقفنا ہے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔

اور مباحثے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل پر جو معرکہ ہوا ردیف ی میں درج ہے دیکھو ع

یہاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے

اگرچہ لوازمات شاعری جو ایک ہونہار سخنور کے لئے چاہئیں سب انکی طبیعت میں جمع تھے لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوشِ نقشِ پا۔ آغوشِ نقشِ پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنہوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے بھی اُونچا اُڑنے لگا۔ یہ وہاں سے چپکے چلے آئے۔ اُن دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام کے افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک جا پہنچے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے۔ وہاں میر کلّو حقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا۔ اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے اُنہیں پاس بٹھایا اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدّر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا اُنہوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہیں تو سناؤ! انہوں نے وہی غزل سنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملے پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کریگا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک ان کے لئے دعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب موصوف کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی دیکھو ردیف الف میں ع

رکھتا بہر قدم ہے یہ وہ ہوشِ نقشِ پا

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے طبیعت

کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دِلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑ گئی۔ اور کلام کا چرچا بڑھا۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں +

قلعہ میں کس تقریب سے پہنچے۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنہیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابو ظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لئے دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ میر غالب علیخاں سید۔ عبد الرحمن خانِ احسان۔ برہان الدین خانِ زار۔ حکیم قدرت اللہ خان قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم۔ مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا۔ میر قمر الدین منت اور ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع طرح میں ڈالتے تھے ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربارِ ولیعہدی میں جانے لگے +

قدرتی سامان

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین انکی غزل بنانے لگے۔ اُنہیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ اُنہیں ایک

میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارتِ خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں اُن کے مختارِ کل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے۔ کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان حاصل ہو گیا۔ اور وہ چلے گئے ۔

ولیعہد شاگرد ہوتے ہیں

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آ کر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم اور کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔ اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپیہ کے فقط ۵ سو روپے مہینا ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکارِ ولیعہدی سے للعہ مہینا بھی ہو گیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب و داب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔ لیکن اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ نہ سمجھنا یہ ایوانِ ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولیعہد کے استاد ہو گئے ۔

نواب الٰہی بخش خاں اصلاح لیتے ہیں

دلی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر علوم ضروری سے

باخبر اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ اِس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ جہاں متاعِ نیک دیکھتے تھے۔ نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے اُن کا کلام گذرانا تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علیخاں غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو اُنہیں اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے دولت فقر کی برکت سے ترکِ دُنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹۔ ۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے بعد وہاں بیٹھکر وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن ایک چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ سے سُننے کو جی چاہتا ہے۔ استاد نے کہا کہ کل تو کام ہے۔ کہدینا کہ پرسوں حاضر ہونگا۔ تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بزرگانہ اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوے معمولی کے شعر کی فرمایش کی۔ انہوں نے ایک غزل شروع کی تھی اُس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی	چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور لطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اُسی وقت آنکلے ✤

نواب اُنہیں دیکھ کر مسکرائے۔ اور شیخ مرحوم نے اُسی طرح اُٹھکر سلام کیا جو سعادتمند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا۔ اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں جاتا غرض اُنہوں نے اپنے شعر پڑھنے

استاد کا ادب

شروع کر دئے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا۔ کان بدمزہ ہوگئے کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستاد مرحوم نے اُنہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلع اُس کے پڑھے :-

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا

گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

نواب الٰہی بخش خاں معروف فن شعر کے کامل ماہر تھے

اُس دن سے معمول ہوگیا کہ ہفتہ میں دو دن جاتے۔ اُن سے غزل لے آتے اور اصلاح کی ہوئی دے آتے۔ چنانچہ جو دیوانِ **معروف** اب رائج ہے وہ تمام کمال انہیں کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نوابِ مرحوم اگرچہ ضعفِ پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کے حقائق و دقایق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے اُس عالم میں استادِ مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمایش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔ فرماتے تھے کہ اپنی مُدت شوق میں وہ بھی کبھی **جرأت** کبھی **سودا** کبھی **میر** کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر انیر میں کچھ بمقتضائے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحبدل اور صاحبِ نسبت تھے۔ خواجہ **میر درد** کی طرز میں آگئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اَور تھا۔ جوانی دوانی۔ **جرأت** کے رنگ میں۔ کبھی **سودا** کے انداز میں۔ اور وہ رو سکتے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہکر دکھاتے۔ اب اُن کا دیوان ویسا بنا دیتے جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے۔ اور کہتے۔ ہائے الٰہی بخش خاں۔ اُن کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اور اس طرح ذکر کرتے تھے۔ جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سیکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا

کے کاموں کا دستور العمل ہیں ؎

الٰہی بخش خاں مرحوم کی سخاوت

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا - جو آتا تھا - امیر - فقیر - بچہ - بوڑھا اُسے بغیر دئے نہ رہتے تھے - اور دینا بھی وہی کہ جو اُس کے مناسب حال ہو کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے - اِس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھکر بناتے جاؤ سُناتے جاؤ - میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر اُن کی خوشی اُسی میں دیکھی تو مجبور رہا اور یہی خوب ہوا ؎

ایک دِن میں اُن کا دو غزلہ بنا رہا تھا - اُس کا مقطع تھا +

اِک غزل پر درد سی معروف لکھ اس طرح میں	ذوق ہے دِل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے	جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

تلوار کی قدردانی

سوداگر آیا اپنی چیزیں دکھانے لگا - اُن میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی - وہ پسند آئی خم دَم - آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا - ع

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

مَیں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا - بہت خوش ہوئے +

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج	اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ تلوار بھی لے لی - میں حیران ہوا کہ یہ نواب کے حالات و خیالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی - اسے کیا کرینگے - خدا کی قدرت ۲ - ۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے - وہاں سے انکے پاس آئے - باتیں چیتیں ہوئیں - جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی - جب چلنے لگے تو اُنہوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش	چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں - ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر

سے لیا تھا وہ انہیں دیا ؎

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی۔ اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہکر لگائی تھی۔ جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مَثَل۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کے بذل وکرم اور حُسنِ اخلاق اور علوِ رتبہ کے سبب سے اکثر شرفا خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے۔ اور اشعار سُنتے سُناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اَوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں آشفتہ ایک پُرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور اِن کے مرید تھے صمہ وظیفہ بھی پاتے تھے۔ آشفتہ کے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا :۔

تسبیح زمرد

سو روپیہ کو ایک محاورہ خرید لیا

آج یہاں کل وہاں۔ گذرے یُوں ہیں جگ ہمیں	کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہیں

آشفتہ کو سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دے دیئے کہ تمہاری کاوش طبع کیوں خالی جائے ؎

فرماتے تھے ایک دن مجھے ایک غزل دی اور کہا کہ میاں ابراہیم یہ غزل ہماری مُدّت سے پڑی ہے۔ دیوان میں درج نہیں کی۔ ردی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مطلع اس کا ہمیں پسند ہے۔ مطلع :۔

میں جو لکھنے لگا کچھ یار کے ناخونوں میں	بولے رکھ چھوڑے ہیں تجھ سا رکے ناخونوں میں

اُسی وقت عذر معقول میری سمجھ میں آگیا۔ اور معروف اس خوبی سے موزوں ہوا :۔

غلط العام فصیح ہے سخن میں معروف	پھر سخن کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں

دِلّی میں آب حیات کو دیکھ کر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کمال

بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہو گا۔ اس مضمون کو تم نکال ڈالو میں کیا کہوں کہ اُستاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اُن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے اب تک بھی میرے پاس موجود ہیں۔ دِکھاؤں کسے +

سخاوت کا انداز تو دیکھو

استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ میں نے گوشۂ جانماز اُٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ میں سمجھ گیا اور لے لئے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں۔ جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔ پھر جب کچھ دیتے تو اسی طرح دیتے۔ یہ گوشۂ جانماز اُٹھاتے اور لے لیتے +

حقہ اس طرح پلواتے ہیں

ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ مگر نواب صاحب حُقّہ پلوائیں تو خالی کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گُڑگُڑی۔ چلم اور چمبل۔ مغرق نیچہ۔ مرصّع مُہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دی +

بچہ بھی خالی نہ جائے

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا زین زرّیں کسا ہوا۔ اُس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانیگا کہ میں کس کے پاس گیا تھا +

شاہ نصیر مرحوم سے معرکہ آرائی ہوتی ہے

اِدھر ولیعہد بہادر کی فرمائشیں۔ اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں۔ کہ کئی برس کے بعد **شاہ نصیر** مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں انہوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں

سُنائی۔ اور کہا اِس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں استاد مانتا ہوں[ل]۔ دوسرے مُشاعرہ میں اُنہوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اُس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اُس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنہوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ مگر ولیعہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے جو کہا تھا۔ وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:۔

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں ۔۔ کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا۔ اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سُنایا۔ اسکے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں ؎

شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو۔ بر سر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا۔ کہ انہوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ کہ آپ کے اعتراضوں کے لئے قابلِ خطاب ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ اِنہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا۔ کہ خیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے۔ کہ فاصلہ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں۔ تو تقریر فرمائیے۔ قصیدہ کا مطلع تھا:۔

معرکۂ عجیب

صرصر وکوہ میں ہوں گر آتش وآب وخاک وباد ۔۔ آج نہ چل سکینگے پر آتش وآب وخاک وباد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے۔ تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی معترض

[ل] یہ طنز ہے شیخ مرحوم پر کہ ولیعہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کے استاد کہلاتے تھے ؎

نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انہوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اُس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان سوال و جواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعۃً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا:۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم	آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

مشاعرہ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گذرانا۔ ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُس نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا۔ کہ تغلیب ہے۔ اُس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب تک کسی استاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھکر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے استاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی استاد نہ ہوا؟ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پر منحصر رکھنا چاہیئے۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔

تکمیل علوم کے قدرتی سامان

اُسی دن سے تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزیٔ طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب رام

نے ان سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چنانچہ یہ نوبت ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے۔ تو راجہ صاحب کا آدمی انہیں ڈھونڈ کر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا +

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی۔ اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد[1] صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے اور میرے والدِ مرحوم اُنہیں کا علاج کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اُن سے جاکر پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ رواجِ اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے۔ جس بحر میں چاہو لکھو۔ استاد کے مسوّدوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اُسکے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں +

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مئے عشرت کے سبو تھے	یا قلزمِ مستی کے حباب لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں	ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

دربارِ شاہی سے خاقانیِ ہند خطاب ملتا ہے

چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہکر سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد ۱۸ تھی مطلع اُس کا یہ ہے :-

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن	آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی

[1] حکیم مرزا محمد صاحب علم و فضل کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع الکمالات تھے طب میں حکیم شریف خاں مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم محمود خاں کے دادا تھے حکیم مرزا محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور اُنکے والد بھی صاحب علم و فضل شاعر تھے۔ کامل تخلص کرتے تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر مصنف حدائق البلاغت کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک مبسوط رسالہ علم قوافی میں نے دیکھا ہوا ہے اُنہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے تین باب باقی تھے کہ دنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علما نے کتاب مذکورہ کے جواب لکھے ہیں۔ مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے۔ کسی نے نہیں لکھا +

عمر ۱۹ برس کی تھی ؏

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا - کہ ایک جنازہ رکھا ہے بہت سے لوگ گرد جمع ہیں - وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے - ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں - اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں - حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے - اور جنازہ کس کا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے - اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوتے ہیں ؏

خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا - کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا - اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی - کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے - اُسے بھی تو دیکھنا چاہئے - چنانچہ قصیدہ مذکور لاکر پڑھا گیا میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعراے قدیم کے صحبت یافتہ تھے - سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے - کلام کو بھی تو دیکھو - ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا - مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُس وقت بھی کہا تھا - اور جب میں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بیخبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا - تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے - بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے - اپنا کام کئے جاؤ - ۳۶ برس کی عمر تھی - جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی - اور اُس کی تاریخ کہی ع ← توبہ اور توبہ کی تاریخ

	اے ذوق بگو سہ بار توبہ	

مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے - تو اُنہوں نے یہ پہلے قصیدہ گذرانا ← مبارک ہو شاگرد بادشاہ ہوا

لہ حافظ احمد یار سید انشا کے یار تھے - یہ عجب شگفتہ مزاج خوش طبع سخن فہم شخص تھے - باوجودیکہ استاد جوان تھے - وہ بڈھے تھے - مگر یاروں کی طرح ملتے تھے - حافظ مرحوم اُنہیں مولوی صاحب کے داماد تھے - جنہوں نے حلت زاغ کا فتوے دیا تھا - اور سودا نے اُس کی ہجو کہی تھی - ترجیع بند مخمس میں ع اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے ؏

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق	ہے ذرّہ ترا پرتوہ نورِ سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کے لئے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقع آتے۔ تو استاد کے لئے یہ ہوا۔ کہ للعہ، مہینے سے صہ، ہو گئے صہ سے معہ، روپے ہو گئے۔ جب بادشاہ ہوئے۔ اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر استاد شاہی کو نت ۳ مہینا! پھر بھی انہوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لئے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے۔ اور شعر موزوں کیا کرتے تھے چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چستی اور دُرستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:۔

یُوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے	اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں جانتے زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے ہیں عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے۔ وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اُس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنے ادنے منشی متصدی اُس کے لکھنے پڑھنے ہونگے۔ وہ کیسا ترستا ہوگا۔ کہ نہ اُنکے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی +

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہو گئی۔ تمام کنبا قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علیخاں مرحوم مختار ہو گئے۔ تب استاد شاہی کا سو روپیہ مہینا ہوا۔ ہمیشہ

لہ فراش خانہ کی کھڑکی رہتے گئے +

عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارک باد کے پڑھتے تھے۔ اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے ❊

اواخرِ ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنہوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہکر نذر گذرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا ❊

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گذرانا جس کا مطلع ہے۔ ع

شب کو میں اپنے سرِ بستر خوابِ راحت

اُس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا ❊

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا۔ قریب شام میں بھی موجود تھا کہ اُنہیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور اُنہوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا۔ آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ۔ شاعروں ہی کا ضعف ہو گیا۔ حافظ ویران بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ مسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ اس عالم میں بھی مبالغہ قایم ہے۔ خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہوا۔ رات اُسی حالت سے گذری۔ صبح ہونے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں ان کی کہیں آج تک کسی بادشاہ یا صاحب کمال کو نصیب نہیں ہوئیں ❊

اُردو اخبار اُن دنوں دہلی میں جاری تھا۔ برس دن تک کوئی پرچہ اُس کا ایسا نہ تھا جس میں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں ❊

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسّط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ	پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ ان کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیندہ۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے۔ تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتا تھا۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اَور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے ؛

قوّتِ حافظہ

صانع قدرت جنہیں صاحب کمال کرتا ہے اُنہیں اکثر صفتیں وہ دیتا ہے جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ تیزیِٔ ذہن اور برّاقیِٔ طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوّتِ حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالمِ شیر خواری کا اُنہوں نے بیان کیا جسے سُن کر سب تعجب کرینگے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اُس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا اور آپ کسی کام کو چلی گئیں۔ ایک بلی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اُس سے اور خُر خُر کی آواز سے نہایت تکلیف ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آ گئیں۔ اُنہوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونو کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ جب بڑا ہوا۔ تو

مَیں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یاد کرکے اس واقعہ کی تصدیق کی - اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی ۔

صلاحیتِ طبع

صلاحیتِ طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے - اور کہتے تھے کہ ایک دن املی کے درخت میں کنکوّا اٹک گیا - میں اُتارنے کو اوپر چڑھ گیا - ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا - وہ ٹوٹ گئی - میں نیچے آپڑا - بہت چوٹ لگی - مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوّا اڑایا - نہ درخت پر چڑھا ۔

خوفِ خدا

عُمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا - عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا - شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھیری - ایک ایک جُز کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمّہ ہوا چنانچہ ۔ ہم چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا - ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلادئے - اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے - اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے پل مزے کے لئے ۔ ہم بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے - یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں - اور اپنی پیاری زندگی کے لئے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں - اُسی وقت اُٹھا - اُنہیں چھوڑ دیا - اور سب سامان توڑ پھوڑ یاروں میں جاکر کہدیا کہ بھئی ہم اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے ۔

خوفِ خدا

عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے - دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے - رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا - اُس وقت حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے - اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی - فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا - مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے - تجھے کے رکعت کا ثواب ہوگا - پھر

پھر یہ قطعہ پڑھا :-

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک ذات	کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است	کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

خوفِ خدا میں لطیفہ

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا - بادشاہ قطب میں تھے - یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے - اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے ع شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت ٭ چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں - اور جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں - یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے - ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی - انہوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا - تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی ٭ انہوں نے پھر اُڑا دیا - جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنسکر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے ؟ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے وہ نابینا تھے - اُنہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا ؟ میں نے حال بیان کیا - ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی - استاد نے کہا بیٹھے کیونکر ؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے - عالم ہے - حافظ ہے - ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ پڑھ کر کُلُوا وَاشْرَبُوا کہیگا اور بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَر کردیگا - دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے ٭

ایسے صاحب نظر کہاں ہوتے ہیں

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا - خان آرزو کی تصنیفات - ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں مگر مجھے اس کا تعجب نہیں - اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں - گفتگو کے وقت جس ترا تے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اِس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں - ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مُورّخ تھے - تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا

تصوف

معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں۔ یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علم اشراق کا پرتوہ دیکر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے۔ کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے۔ ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے آجتک دل پر نقش ہے رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں اُنہیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا بڑا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اُن کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے ۔

علم طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو۔ بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے ۔

چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا

کہتے تھے کہ شعر کا بچپن سے عشق ہے۔ ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے ۱۰۰ برس سیکھے ۱۰۰ برس سُنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر ۱۰۰ برس بیٹھکر اَوروں کو سُنائے اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہیگا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور؟ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم و رمل کا ایک صاحب کمال مغلپورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا

نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لئے ۷۷ برس چاہئے ہیں۔ یہ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہوگیا ٭

نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا کہ ولیعہدی کا زمانہ تھا۔ مرزا مغل بیگ کا بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم بے تربیت جاہل تھا۔ غریبی سے بھائی کی بدولت آسودہ ہوگیا تھا۔ وضع کو تراشتا تھا۔ سرکار میں صاحبِ خدمت تھا۔ کاروبار میں دخیل تھا۔ یہی لوگ اجزائے دربار تھے۔ استاد جاتے تو انہیں میں بیٹھنا اور وقت گذارنا پڑتا۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا۔ اُس سے ہنسا کرتے اور دل بہلایا کرتے۔ اُس کی ایک رنڈی بھی تھی۔ استاد کبھی کبھی کہتے کہو تمہاری وہ کیسی ہیں؟ وہ کہتا خوب! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے۔ اور کہتے کیوں جی آج رات کو تو جوتی چلتی رہی۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات کو تو مزے ہیں تھے۔ کیوں جی وہ عطر ہی پر بگڑی تھی یا اور بات پر۔ روشن بیگ سوچتا کہ انہیں کہاں سے خبر ہو جاتی ہے۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اُس سے ملتے نہ ہوں۔ گھبراتا اور شرماتا ٭ اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انہیں نجوم میں بڑا دخل ہے۔ ایک دن اُستاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے۔ خبر ہوئی۔ باہر آئے۔ مٹھی سامنے بند کر کے اُن سے پوچھا۔ بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ۔ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ گوشت کی بوٹی معلوم ہوتی ہے۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی وہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انہوں نے اُس دن سے توبہ کی۔ پھر کبھی موقع ہی آ جائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی ٭

نجوم در دل

کھمن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مردِ

دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اِنہوں نے بے اظہارِ نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحب کمال ہو۔ اور غالباً کمال اُس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعثِ تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اُس کی عمر کیا ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ ۶۷ - ۶۸ حد ۶۹ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرے پر آثارِ ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت کہ ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیئے لیکن واقعہ نظر پیش گذرا تھا اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا کہ اُنہیں آخرِ عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنہوں نے مبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُس وقت اس قصیدہ کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اُس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

عجیب پیشین گوئی

زہے نشاط کہ گر کیجیئے اُسے تحریر	عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اِس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مُسکراتے جاتے تھے اور بڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ	کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور! ظہوری کا ساقی نامہ ہو گیا۔ چپ ہو گئے۔ اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گھلا جاتا ہوں اسکی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ ان کی طبیعت کو خدائے تعالےٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں

گذارہ کا انداز:

خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی جاڑا برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گذر جاتی تھیں۔ اُنہیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دنیا کے شادی و غم سے انہیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے۔ اور جب ہی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے ؛

پاک خیال

ہر وضو کے بعد ایک لوٹے سے برابر کُلیاں کئے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسف ہوکر بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کرکے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہکر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے سواک سے

معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہوکر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے

اوراد و وظائف

کلیاں کرکے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیر آسمان کبھی ٹہلتے جاتے کبھی قبلہ رو ٹھیر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے مگر اکثر اوقات اس جوش دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا گویا سینہ پھٹ جائیگا ؛

وظیفہ پڑھکر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیکخواہی کا اس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی کہ الٰہی ایمان کی سلامتی۔ بدن کی صحت۔ دنیا کی عزّت و حرمت۔ پھر۔ الٰہی میرے بادشاہ کو با دولت با اقبال صحیح و سالم رکھ۔ اُس کے دشمن رد ہوں وغیرہ وغیرہ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لئے۔ پھر اپنے عیال اور خاص خاص دوستوں کے لئے

یا جو کسی دوست کے لئے خاص مشکل درپیش ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک شب اس موقع پر میرے والدِ مرحوم اُنہیں کے ہاں تھے۔ ساری دُعائیں سُنا کئے۔ چنانچہ اُن کے دروازے کے سامنے محلہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دُعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آگیا۔ کہا کہ الٰہی جمّا حلال خور کا بیل بیمار ہے اُسے بھی شفا دے۔ بیچارا بڑا غریب ہے بیل مرجائیگا تو یہ بھی مرجائیگا والد نے جب یہ سنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ اُنہیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھُلا ❖

ترتیبِ دیوان

فصاحت کا دل خون ہوتا ہے جب اُن کے دیوان مختصر پر نگاہ پڑتی ہے اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے۔ اور مرثیہ خوانی اُس کی میرا فرض ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ ۱۵-۱۶ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مُرتّب کیا تھا۔ اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جدا کاغذ پر لکھی جاتی۔ اسی طرح طاق میں رکھ دیتے۔ کہ فرصت میں نظرِ ثانی کرینگے جب طاق بھر گیا۔ تکیہ کے غلاف میں بھرے اور گھر میں دیدئیے اور کہدیا کہ احتیاط سے رکھنا۔ کبھی مٹکے میں کبھی ٹھلیا میں بھرے اور گھر میں بھجوا دئیے کہ ضائع نہ ہو۔ اس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے ٹھلیاں بھر گئے تھے ❖

والدِ مرحوم نے آغازِ شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے۔ تو استاد کا کلام اُن سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بداندیشوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس لئے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والدِ مرحوم کو دیتے۔ جانتے تھے کہ اب محفوظ ہوگئی ❖

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا کیونکہ بچپن سے لیکر دمِ واپسین تک کا کلام انہیں میں تھا۔ اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں ٭

چنانچہ اوّل اُن کی اچھی غزلیں اور قصاید انتخاب کرلئے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہ و بالا ہوجائیگا۔ حسرتوں کے خون بہ جائینگے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائینگے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کرگئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے۔ اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ انکی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہ ہی خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہوجائیگا مگر استاد کہاں سے پیدا ہونگے۔ جو غزلیں پھر آکر کہینگے۔ اب اُنکے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہیگا۔ وُہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔

حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض دردخواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسوّدوں کا سرمایہ تو سب دلّی کے ساتھ برباد ہوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا۔ اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت

کے محتاج نہیں تھے باوجود اس کے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی غرضکہ ایک مشکل میں کئی کئی شکلیں تھیں۔ اُنہوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور ۱۲۷۹ ہجری میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام۔ بہت سے متفرق اشعار۔ اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں رات کی شب براتیں بدن کے آرام۔ دل کی خوشیاں طبیعت کی اُمنگیں۔ سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا۔ جس کی انتہا تمنا یہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہیگا۔ تباہ کار زمانہ کے ہاتھوں آج اُس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنٰے ادنٰے شاگردوں کو صاحبِ دیوان کر دیا۔ اس کو یہ دیوان نصیب ہوا ؎ یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے ✣ میرے پاس بعض قصیدے ہیں۔ اکثر غزلیں ہیں۔ یہ داخل ہو جائینگی۔ یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائینگی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں ✣

غزلوں پر رائے

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام جوہر اُن کے کلام کا تازگیٔ مضمون۔ صفائیِ کلام۔ چستیٔ ترکیب۔ خوبیٔ محاورہ۔ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ۔ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے اُن دنوں معرکے ہو رہے تھے اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں۔ اور لوگوں کے لبِ دہن سے واہ واکے نکال لینے میں جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں۔ چست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی الفاظوں کی شکوہ ہیں۔ ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں ✣

چند روز بعد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں۔ اور ولیعہد کے دربار میں

پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشّاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ اُن کی پسند طبع کے بموجب انہیں بھی تصوّف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جُرائت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرات اور سید انشا و مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے اُن کی غزلیں اُنہیں کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے۔ اور پیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشّاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا۔ اُسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا۔ کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورے کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہیں اصول کے لحاظ سے میر۔ مرزا۔ درد۔ مصحفی۔ سیّد انشا۔ جرات بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا اُنہیں کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا اُسی دستور العمل سے انہوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔

قصاید پر رائے

نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کے بعد شیخ مرحوم کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور اُنہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی۔ فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔

ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے - اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں - وہ الگ تھیں - اگر جمع ہوتے تو خاقانیِ ہند کے قصاید خاقانی شروانی سے دو چند ہوتے - جب تک اکبر شاہ زندہ تھے - ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہکر لے جاتے - اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سناتے - دوسرے دن ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے - اور دربارِ شاہی میں سُنواتے! افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی - جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے بڑھاپے کی برکت ہے ❖ کئی مخمّس تھے - بہتیری رباعیاں تھیں - سب اُن کے ساتھ گئیں ❖

مرثیۂ سلام

مرثیۂ سلام کہنے کا اُنہیں موقع نہیں ملا - بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے - شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے ❖

ہزاروں گیت - ٹپّے - ٹھمریاں - ہولیاں کہیں - وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے ❖

ہجو

اُن کے اور اُن کے دیکھنے والوں کے لئے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلےٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا اور چند آدمیوں سے انہیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا - مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا - خدا ہر شخص کو اُس کی نیت کا پھل دیتا ہے - اُس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلوائی - اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جو ہر لطیف ہے اسے بدی سے آلودہ نہ کرنا چاہیئے ❖

اکثر نئے ایجاد و اختراع اُن کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے - کیونکہ بادشاہ کی فرمایشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں - اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا - اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا - اس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا ❖

اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح پہنچ جاتی تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتے۔ اب اگر نئی غزل کہکر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا ۰۷ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کی شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آجائے۔

عموماً اندازِ کلام

کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنہیں ایسی شان وشکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انہیں قادر الکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور مُنہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طبیبِ کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائیگا۔ اور کونسا رنگینی میں۔ کامل مصوّر کی تیزیٔ قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح اِن کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ اُنہیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک

مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اُن کے ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہیں۔ خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں۔ جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے۔ یا اُنہوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے۔ جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرتِ کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔

ہمیشہ فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے۔ اور اپنے کلام کو آپ اُلٹ پلٹ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سُنے اور لکھے نظر آتے ہیں۔ اُن کا کلام جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے۔ اُن کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ زور فقط اُن کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا۔ بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو اُن کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتوہ ڈالتا ہے۔

ان کے دیوان کو جب نظرِ غور سے دیکھا جاتا ہے تو اُس سے رنگارنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انکے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے۔ اور مضامین کے طبیب تھے۔ جس طرح چاہتے تھے ترکیب دیتے تھے۔ خیال ہندی

ہو یا عاشقانہ یا تصوّف۔ ان کے سینہ میں جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اس واسطے کلام ان کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے۔ دِل دِل کے خیال باندھتے۔ اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے۔

طرز اصلاح

شاگردوں کی غزل بڑی توجہ سے درست کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اور اُستاد اس قدر زیادہ اصلاح نہیں دیتے۔ فرمایا کہ میری غزل پر استاد توجہ کم کرتے تھے اکثر واپس بھی کر دیتے تھے کہ دوبارہ دیکھو۔ طبیعت پر زور دے کر کہو۔ بعض شعر کاٹ دیتے تھے۔ مجھے رنج ہوتا تھا۔ اس لئے شاگردوں کے کلام کا درد آتا ہے۔ اور کاوش سے درست کرتا ہوں۔

اس میں خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُس کی حیثیت اور استعداد سے گھٹنے یا بڑھنے نہ پاتا تھا۔ اور کیفیت اس کی مشاعرہ کی غزلوں میں کھلتی تھی۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے۔ ولی عہد کی غزل بھی بناتے تھے۔ اور جب جدا جدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولی عہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام بعد اصلاح کے اپنے انداز پر تھا۔ ویران اپنی جگہ داغ اپنی جگہ۔ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ۔

اعتراض

ان کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پرانی غزل کا شعر ہے:

سر بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے	یہ نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں ی زیادہ کرنی جائز نہیں۔ مگر یہ اعتراض اُن کی کم نظری کے سبب سے تھے۔

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے	بہ نیروے مردے برآید ز جائے
اے زدہ برتر از گماں دامنِ کبریائے را	دست بتو کجا رسد عقل شکستہ پائے را

ایک پرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی :-

دانۂ خرمن ہے ہیں قطرہ ہے دریا ہم کو	آئے ہے جُز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جزو مع واو کے ہے۔ فقط جُز صحیح نہیں۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں :-

ہر چہ کند در جُز و در کل اثر	کُلّی و جُزئیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں :-

جُز مرتبۂ کل کو۔ حاصل کرے ہے آخر	ایک قطرہ نہ دیکھا جو۔ دریا نہ ہوا ہوگا

ایک دن میں اوج سے ملا اور استاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا :-

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جاے	صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جاے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا۔

یہاں جو برگِ گُل خورشید کا کھڑکا ہو جاے	دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جاے

اور کہا کہ دیکھا ! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جاے جو اُستاد نے باندھا ہے۔ یہ جائز نہیں مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر ! میری طرف دیکھکر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی ؛

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اُس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے یعنے روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی۔ نہ ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اَور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسن اتّفاق ہے، کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ۔ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت

کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل عامیانہ۔ اب ثقہ متین اور شریفانہ ہے ٭

آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے:۔

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں	سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں۔ شمشیر کا کھیت نہیں ہے ٭

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے:۔

مُنہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے	ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نواب کلب حسین خاں نادر تلخیص معلّےٰ میں فرماتے ہیں (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے۔ پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہیئے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا ٭

نقل۔ شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ ابھی نوجوانی کا عالم تھا حسب معمول استاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لئے ہوئے آئے۔ اُس میں دہی تھا۔ کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا۔ انہیں ریزش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا سنکھیا ہے سنکھیا۔ کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ استاد نے ہنس دیا اور کہا کہ ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

مصرع میاں مجذوبؔ کا ہے۔ مگر کھانے کا موقع تھا اس لئے سب کو بہت مزا دیا ٭

ایک دن حسب معمول حضور میں گئے۔ مرزا شاہرخ[1] ایک بیٹے حضور کے تھے اُنہوں نے اُن دنوں بہت سے کاروبار کی خدمتیں قبضہ میں لے رکھی تھیں اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے کہ بیٹھے وہ بھی آ ہی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ حضور کی ایک غزل ہے اُس کے ہر شعر میں ایک مصرع لگا کر مثلث کرنا چاہتے

[1] مرزا رفیع سودا کے بیٹے لگائے تھے۔ شاید بیٹے تھے ٭

ہیں۔ مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے۔ بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے۔ غرض بادشاہ نے وہ غزل انہیں دی کہ استاد اس پر مصرع لگادو! انہوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی۔ اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں تیسرے میں مسلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اُسی وقت پڑھکر سُنائی۔ سب حیران ہو گئے۔ بلکہ مرزا شاہرخ نے کہا کہ استاد آپ گھر سے کہکر لائے تھے۔ بادشاہ بولے۔ بھلا انہیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے +

نقل۔ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب میں تھے۔ مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) شبِ مہتاب میں تلاؤ کے کنارہ چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ استاد مرحوم پاس کھڑے تھے۔ اُنہیں بھی شعر کا شوق تھا اور شاگرد تھے۔ اُن کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ ع

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ان سے کہا کہ استاد اس پر مصرع لگائیے گا۔ انہوں نے فوراً کہا۔ ع

عکسِ رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

نوّاب حامد علیخاں کے خسر نواب فضل علیخاں سے اور شیخ مرحوم سے سابقۂ محبت بھی تھا۔ اس لئے نواب حامد علیخاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سُنتے سُناتے تھے۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا :۔

جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے	اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

استاد مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کوّا چھڑواتے ہیں اس لئے زیادہ تر مناسب ہے :۔

زاغ بھی گر ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے	اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

بدیہہ

فرماتے تھے کہ جوانی کا آغاز۔ اور میری بدیہہ گوئی پر نظریں پڑتی تھیں کہ ایک دن میر محمد خاں اعظم الدولہ کے بالاخانہ کے نیچے سے میرا گذر ہوا۔ وہ پُرانے شاعر تھے۔ اور سرور تخلص کرتے تھے۔ مجھے دیکھ کر آواز دی۔ میں گیا۔ بیٹھتے ہی فرمائش کی کہ۔ تذکرہ ہم نے تمام کردیا۔ اب اس کی تاریخ کہدو۔ میں نے کہا۔ اچھا فکر کرونگا۔ اُنہوں نے کہا۔ فکر کرونگا کی سہی نہیں۔ ابھی فکر کرو۔ اور کہدو۔ فرماتے تھے۔ خدا کی قدرت۔ ان کے خطاب کے خیال سے اُسی وقت ذہن میں آیا۔ دریائے اعظم۔ حساب کیا تو عدد برابر۔ عجب خوشی دل کو ہوئی۔ میں نے جھٹ کہ دیا۔ ہنسے اور کہا۔ پہلے سے کہہ رکھی ہوگی۔ پھر کہا۔ مصرع ابھی لگادو۔ میں نے کہا کہ مصرع پھر انشاء اللہ۔ جو بات تھی وہ ہوگئی ✣

زہے طبع حاضر

ایک دن معمولی دربار تھا۔ استاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشد زادے کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے عرض کی صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے استاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ استاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ استاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ آواخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہوگیا ✣

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہوکر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے وہیں بُلالیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ استاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال

پوچھا۔ کہا کہ وہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا اُس کے وہ! اشعار آج ہمیں یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لئے کہتے ہو۔ ہم مر جائینگے تو جو تخت پر بیٹھیگا اُس کے لئے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردّد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائینگے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امرا ان کے عہد میں کہاں تھے عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرامگاہ کے امرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمائیے۔ جو جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔ اور اپنا سامان مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دُنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے ٭

شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے آواخر عمر میں روزہ نہ رکھتے تھے۔ حسب حال
مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں وہ عالم نہان و آشکار کا ہے۔ اُس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے ٭

پھر ایک دفعہ رمضان کا مہینا تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیے چونکہ وُہ اُس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔

اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آیئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔ جب اُس نے کٹورا لا کر دیا تو یہ مطلع کہا۔ کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلائیے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری	خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

تاریخ

تاریخ کی کمائی بھی سب بادشاہ کے حصّہ میں آئی۔ کیونکہ اکثر اُنہی کی فرمایش سے کہتے تھے۔ اُنہی کا تخلص ہوتا تھا۔ نوّاب زینت محل بیگم۔ بادشاہ بیگم تھیں۔ اور کل احکام سلطنت کی حاکم تھیں۔ اُنہوں نے شہر میں ایک مکان بنوایا۔ تاریخ کے لئے بادشاہ سے عرض کی۔ اُنہوں نے دربار خلوت میں استاد سے فرمایا۔ بیگم بولیں کہ حضور استاد سے کہئے کہ آج تاریخ کہکر جائیں۔ استاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا۔

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل	تاریخ گفتم بر محل۔ این خانۂ زینت محل

ایسی ایسی تاریخیں سینکڑوں کہدیتے تھے۔ یاد کہاں! اور لکھے کون؟

والد مرحوم نے بہ نیّت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کرکے کہا تعزیت گاہِ امامِ دارین۔ پوری تاریخ ہے ٭

بدیہہ

حکیم میر فیض علی مرحوم طب میں ان کے استاد تھے اور اُنہیں کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اٹھکر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعۃً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ یوں تاریخیں سینکڑوں کہدیں۔ کہاں تک لکھوں! اور یاد کہاں؟

ایک شخص نے کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمایش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوادو کہ جس میں دونو نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آیئے گا۔ انشاء اللہ ہو جاویگا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہونگے۔

جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بُلانا انہیں - لینا لینا - خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہوگئی - مجھ سے مخاطب ہو کر کہا -

ع	پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سن کر مصرع طرح بھیجا اور بلا بھیجا - آپ نے غزل کہکر بھیجی اور مقطع میں لکھا -

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن	کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اُنہوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے - ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا فرمایا -

نقل - کوئی مسافر دلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا - یہاں ایک کُتا ہل گیا تھا - وہ وفا کا مارا ساتھ ہولیا - شاہدرہ پہنچکر دلّی یاد آئی اور رہ گیا - وہاں کے کتوں کو دیکھا گردنیں فربہ - بدن تیار چکنی چکنی پشم - ایک کتا اِنہیں دیکھ کر خوش ہوا - اور دلی کا سمجھکر بہت خاطر کی - دلہائیوں کے بازار میں لے گیا - حلوائی کی دُکان سے ایک بالوشاہی اُڑاکر سامنے رکھا - بھٹیارہ کی دُکان سے ایک کلہ جھپٹا - یہ ضیافتیں کھاتے اور دلی کی باتیں سناتے رہے - تیسرے دن رخصت مانگی اُس نے روکا - اِنہوں نے دلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے - آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے - اُسے بھی خیال رہا اور ایک دن دلّی کا رخ کیا - پہلے ہی مرگھٹ کے کُتے مردار خوار - خونی آنکھیں - کالے کالے منہ نظر آئے - یہ لڑتے بھڑتے نکلے - دریا ملا - دیر تک کنارہ پر پھرے - آخر کود پڑے مرکھپ کر پار پہنچے - شام ہوگئی تھی - شہر میں گلی کوچوں کے کُتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے - بظاہر خوش ہوئے اور کہا او ہو اس وقت تم کہاں ؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا - ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا - اُسے لے کر ادھر ادھر پھرنے لگے -

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا — دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا
دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا — وہ مل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا
خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا — آخر کو پھر جو دیکھا تو زیر زمیں گیا
دیکھا کہیں نہ اسکو جو دیکھا تو اپنے پاس — میں دور دور جوں نگہ دور بیں گیا

کیا کیا مزا نہ تیرے ستم کا اُٹھالیا — ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اُٹھالیا
یوں لائے واں سے ہم دل سیپارہ کرکے جمع — دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا
جو بار آسمان و زمیں سے نہ اُٹھ سکا — تو نے غضب کیا دل شیدا اُٹھالیا
سر ہم نے جب سے پائے صنم پر ہے رکھ دیا — دونو جہاں سے دست تمنا اُٹھا لیا

مرض الوفات سے تین دن پہلے غزل کہی اور مجھے سُنائی۔ پھر ملازم کو دی کہ اندر کے طاق میں احتیاط سے رکھ دے۔ میں اکثر اُسی وقت اپنی کتاب میں نقل کرلیتا تھا۔ بدترین اتفاق یہ کہ اُس وقت خیال نہ آیا۔ دوسرے دن بیمار ہو گئے۔ پھر نقل کا کسے ہوش تھا۔ انتقال کے بعد ہر چند ڈھونڈھی۔ نہ ملی۔ یہ شعر یاد رہ گئے وہی لکھ دیتا ہوں :-

کیا کہیں اُس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا — وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا
بوتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مست غرور — گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا
کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر — ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا
آفتاب حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد — پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

کروں درد آشنا کیونکر دل احباب اپنا سا — بلا سے جیسا میں ہوں ڈھونڈلوں بیتاب اپنا سا
ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرہ نوازی ہے — دیا بندہ کو اپنے اُس نے خود آداب اپنا سا

آنا تو خفا آنا ۔ جانا تو رُلا جانا — آنا ہے تو کیا آنا ۔ جانا ہے تو کیا جانا
کیا طبع میں جودت ہے چٹ دل کی اُڑا جانا — ہونٹوں کا یہاں ہلنا ۔ وہاں بات کا پا جانا

اے دل نہ راہ عشق کشادہ سمجھ کے جا | یاں اژدہا ہے ہر خطِ جادہ سمجھ کے جا
عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا | اور اس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

اگر رقصاں نہ سر اپنا سنانِ یار پر دیکھا | تو سربازی کا اپنے کیا تماشا اپنا سر دیکھا
جہاں باریک بین و ناتواں میں اس قدر دیکھا | ہلالِ انتیسویں کا سب کو منظورِ نظر دیکھا

رہیگا تشنہ لب سیراب یہ بسمل نہ ہوویگا | میسر جب تک آب خنجر قاتل نہ ہوویگا
کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہ ہوویگا | اگر مہر گواہی میرا داغِ دل نہ ہوویگا

ر کوئی روئے کتابی کا ترے قائل نہ ہوویگا +

چاندنی نے شب تجھ بن روپ دکھایا تھا | مجھ کو ماہتابی پر دھوپ میں بٹھایا تھا

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا | وہ کہیں تم کو کیا ہوا ۔ ہم کہیں تم کو کیا ہوا

آدمی گر ہو مکدر کیا قصور ادراک کا | خاک کا پتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا | کہہ جو تجھے کہنا ہے ۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ دیکھیں کس طرح ہے روز فرقت دیکھکر جیتا | کہ جو عاشق ہو تیرا تیری صورت دیکھکر جیتا

جب قیامت قد ترا اے رشک گلشن بن گیا | اخترِ صبح قیامت خال گردن بن گیا

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا | ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا

بعد قاف عشق تھا جو درس مکتب خانہ تھا | کاف کن کے ما سبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا

مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا | مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا

بل بے گریہ گل زمیں ہو کر قدم گڑنے لگا | اور قدم اُکھڑے تو گیا دیکھا بھنور پڑنے لگا

دل کی طپش نے خم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا | طائرِ جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا | چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا

ہاتھ آ کر دل وحشی جو کوئی چھوٹ گیا | ہوسِ صید سے صیاد کا جی چھوٹ گیا

لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کی مژگاں کا | نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا

دل کہاں جس پر گماں ہو غنچۂ تصویر کا | ہے کوئی سینہ میں خوں آلودہ پیکاں تیر کا

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کریگا | مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا۔ کودنا | ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا۔ اُچھلنا کودنا

مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا | کافر کی دیکھو شوخی۔ گھر میں خدا کے مارا

ہوئے انسان ہم درد محبت کے لئے پیدا	فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا
یارب یہ اس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوا	جس کا برا ہو۔ اُن کو یہ کہنا۔ بھلا ہوا
آج غصّہ سے ادھر کو دستِ قاتل اُٹھ گیا	بس بھروسا زندگی کا ہم کو اے دل اُٹھ گیا
آخر گِل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی	پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا
ہو گیا نامۂ شوق اُن کو سب از بر میرا	کھا گئے ذبح جو وہ کر کے کبوتر میرا
کچھ رازِ نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا	گونگے کا سا ہے خواب۔ بیاں ہو نہیں سکتا
سبزۂ خط اے خضر طریقت یہ کفار سم الخط ہے جُدا	خط بتاں ہے۔ خطِ الٰہی۔ لکھے موسےٰ پڑھے خدا

ردیف بائے موحدہ

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پس جامِ شراب
لب تک اُسکے جو ہوئی دسترسِ جامِ شراب
جھچکا مستی میں وہ صاحب ہوس جام شراب
دل جو ہے جامِ شراب ہوس جام شراب
ساغرِ دل کو جو ہو دسترس جام شراب
بازگشت اپنی ہے یوں جانبِ قسامِ ازل
دست بدمست سبو کی ٹوٹ کے فریاد بہت

لب پہ توبہ ترے دل میں ہوس جامِ شراب
بن گیا خال لب اُس کا مگس جام شراب
عکس خال اپنا جو سمجھا مگس جام شراب
اس میں ہے خال سویدا مگس جام شراب
دست ساقی میں ہو وقت ہوس جام شراب
جیسے ساقی کی طرف باز پس جام شراب
نہ ہوا کوئی بھی فریادرس جام شراب

جوشِ مستی ہے عجب قافلہ جس میں کہ نہیں
بے شکست ایک صدائے جرسِ جامِ شراب

محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا
ٹوٹا گر اک دلِ آتش نفسِ جامِ شراب

رات میخانہ میں ساقی جو نشے میں بہکا
خس شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب

مرغِ دل نرگسِ میگوں کی ہے مژگاں میں اسیر
تازہ مضموں ہے جو باندھوں قفسِ جامِ شراب

دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہو سو ٹکڑے
نام لکھدے جو کوئی میرا پسِ جامِ شراب

ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے
رات بھر گشت کرے ہے عسسِ جامِ شراب

نوشدارو سے بھی بہتر ہے دمِ رنجِ خمار
ساقیا شربتِ فریادرسِ جامِ شراب

بے خبر قافلۂ عیش گذر جاتا ہے
بے زباں ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب

ابلقِ چشمِ سیہ مست کو تیرے دیکھا
ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرسِ جامِ شراب

سبھے میخانہ کی عظمت تو نہ بیٹھے ہرگز
سرِ جمشید پہ اُڑ کر مگسِ جامِ شراب

نخلِ مینا سے خدا جانے کہ ساقی کس کو
پہلے پہنچے ثمرِ پیش رسِ جامِ شراب

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا
عکسِ مژگاں ترا میکش ہے خسِ جامِ شراب

مجھ کو اُس بوسۂ دنداں نے پس از بوسۂ لب
دے نقلِ نمکیں چند پسِ جامِ شراب

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغرِ گل
لب نازک کو ہے اُس کے ہوسِ جامِ شراب

ہو ہجر مدتوں جو ہو وصل ایک دم نصیب
کم ہوگا کوئی ہمسا بھی الفت میں کم نصیب

ہوں میری خاک کو جو تمہارے قدم نصیب
کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب

بہتر ہیں لاکھ لطف و کرم سے ترے ستم
اپنے زہے نصیب کہ ہوں یہ ستم نصیب

ماہی ہو یا کہ ماہ۔ وہ دے ایک یا ہزار
بے داغ ہو نہ دستِ فلک سے درم نصیب

ہے خوش نصیب عشق میں اے بوالہوس وہی
جس کو کہ غم پہ غم ہے الم پر الم نصیب

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو
ہر دم ہے تجھ کو سیر وجود و عدم نصیب

سو بار جوں قلم ہو زباں شمع کی قلم
ایک حرف ہو نہ مثلِ زبانِ قلم نصیب

مجنوں سیاہ خیمۂ لیلےٰ کے گرد پھر / اے خوش نصیب تجھ کو یہ طوفِ حرم نصیب
دے جس کو اپنے ہاتھ سے تو ایک جامِ مے / ساقی دئے خدا نے اُسے مثلِ جم نصیب
ایماں ہے تیرا شوق تھا جس کو یہ نہ ہو / دیدار اُسے خدا کا نہ ہو اے صنم نصیب

جاتے ہیں کوئے یار کو جو اس میں ہو سو ہو
اے ذوق آزماتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

دل عبادت سے چُرانا اور جنت کی طلب / کام چور اس کام پر کس منہ سے اُجرت کی طلب
حشر تک دل میں رہے اُس سرو قامت کی طلب / یہ طلب ہے اپنی یارب کس قیامت کی طلب
دل سلگ جائے نہ جب تک اور بھڑک جائے نہ جاں / کم نہ ہو قلیاں کشِ سوزِ محبت کی طلب
واسطے نظّارۂ قاتل کے فرصت چاہیئے / اور یہاں فرصت کہاں جو کیجئے فرصت کی طلب
ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا / ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب
دور رہ اور دیر مت رہ سامنے مثلِ ہلال / شہر میں تجھکو اگر ہے اپنی شہرت کی طلب
بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اس قدر اپنی کہ ہے / غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب
جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے / کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب
ہو کے دل غمزہ کا بسمل ناز پر دیتا ہے دم / کرتا ہے آفت طلب۔ آفت پہ آفت کی طلب
یاد ہیں صلب و شکم کی پہلی دونو منزلیں / یاں کہاں وسعت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار
گر کشادِ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

کرے ہے شرع کا پاس نمک مدام شراب / حرام ہے۔ نہیں لیکن نمک حرام شراب
یہ ایسا ماہ مبارک۔ وہ ایسا کارِ سعید / شروع دیکھ کے کیجے مہِ صیام شراب

عوض ہے نشۂ دنیا کا ذوق عقبےٰ پر
دوام بکتی ہے اس میکدہ میں دام شراب

اُس بتِ نامہرباں کو ہے پسند اتنا رقیب / وردِ اسمائے الٰہی میں بھی ہے تو یا رقیب

تائے مثناۃ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

ہیں داغِ محبت درم و دامِ محبت
مژدہ تجھے اے خواہشِ انعامِ محبت

ہر روز اُڑا دیتا ہے وہ کر کے تصدق
دو چار اسیرِ قفس و دامِ محبت

مانندِ کباب آگ پہ کرتے ہیں ہمیشہ
دلسوز ترے بسترِ آرامِ محبت

کاسہ میں فلک کے رہے اک بوند نہ زہرآب
دھر کھینچے اگر تشنہ لبِ جامِ محبت

خاکسترِ پروانہ دکھادوں میں اُڑا کر
پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبت

شوقِ حرم کوچۂ قاتل میں کفن کو
ہم جانتے ہیں جامۂ احرامِ محبت

کی جس سے رہ و رسمِ محبت اُسے مارا
پیغامِ قضا ہے ترا پیغامِ محبت

نے زہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو
ہیں بادہ کشِ عشق و مے آشامِ محبت

ایماں کو گرو رکھ کے اگر کفر کو لے مول
کافر نہ ہو گرویدۂ اسلامِ محبت

کہتی تھی وفا نوحہ کناں نعش پہ میری
سونپا کسے تو نے مجھے ناکامِ محبت

معراج سمجھ ذوق تو قاتل کی سناں کو
چڑھ سر کے بل اس زینہ سے تا بامِ محبت

مجنوں نے دی لگا جو سرِ خارزار پشت
پشت اپنے ہجومِ خار سے ہے پشتِ خارپشت

حوروں کے گر ہو پنجۂ مژگاں سے خارپشت
کھجلائے وہ پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی سے تا بماہ ہیں دستِ فلک سے داغ
واں داغدار سینہ ہے یاں داغدار پشت

پیدا فلک سے ایک نہ ہو تجھ سا ماہوش
نہ پشت تک تو کیا کہ تا نہ ہزار پشت

بارِ زمانہ پشت پہ لے کر شتر کی طرح
سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایک بار پشت

ہو جاتی ہے زیادہ گرانباریٔ گناہ
پیری میں ہو خمیدہ نہ کیوں زیرِ بار پشت

سینہ سپر جو منہ پہ ہیں تیغِ نگاہ کی
دکھلاتے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

ڈر ہے یہی کہ ایسا نہ ہو بعد مرگ بھی
لگنے نہ دے زمیں سے دلِ بیقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے، ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

جیم عربی

ہے وہ آزار محبت سے دلِ زار کو رنج
جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

دیدۂ آبلۂ پا کا یہی ہے رونا
کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

جابجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو
ہے جو ناکامیِ فرہاد کا کہسار کو رنج

کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا
اور ہوتا ہے سوا مرغ گرفتار کو رنج

شربتِ خضر بھی دے ہے روشِ تلخیِ مرگ
تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج

راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونو لیکن
یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

سخت جانی سے ہوں لاچار وگرنہ مجھ سے
نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج

سن کے فریاد قفس میں مری خوش ہوں بیدرد
یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغ گرفتار کو رنج

ہوش کو بیچ کے لے داروئے بیہوشی تو
ذوق بیہوش کو آرام ہے ہشیار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج
خط بھیج یا نہ بھیج۔ زبانی خبر تو بھیج

بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

جیم فارسی

اُس پری کو تو نہ لے حیف اے دلِ بیتاب کھینچ
اور لیوے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

یوں گلوئے تشنہ میں وہ آب خنجر ہو فرو
جیسے تفسیدہ زمیں نے ایک دم میں آب کھینچ

وہ مثل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی ؟ خضر نے
لے گیا خطِ آذقن دل کو سوئے گرداب کھینچ

عاشقِ رسوا کے خط میں کیا تکلف چاہیئے
چار حرف اک پرچہ پر دو یوںہیں بے القاب کھینچ

حائے حطی

فرقت کی رات جی چکے ہم تا زمانِ صبح
ہو گی اذان گور ہماری اذانِ صبح

پُر نور ہے ترا رخِ سیمیں بسانِ صبح
آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی کشانِ صبح

تارِ شعاعِ مہر بھی رنگِ شفق میں روز
ماتم میں ہیں مرے مژہ خوں چکانِ صبح

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکیئے
مسجد میں مدّتوں رہے تسبیح خوانِ صبح

پیسے یہ دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے
انجم کے جتنے دانت تھے زیبِ دہانِ صبح

ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں رات دن
یہ میرے نالۂ شب و آہ و فغانِ صبح

یوں پہنچے اُس کی زلف میں عارض سے جانِ دل
منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

اے ذوق کچھ نہ پایا شبِ وصل کا مزہ
یا آج صبح ہم نہیں یا طائرانِ صبح

ٹھیری ہے اُنکے آنے کی اب کل پہ جا صلاح
اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح

منظور چشمِ یار ہے سب عینِ مصلحت
پوچھے بلاکشوں کی کسی سے بلا صلاح

سیدھے ہی جائیں کعبہ کو بیت الصنم سے ہم
گر پھیر دے نہ وہ صنمِ کج ادا صلاح

اُس چشمِ مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم
تقویٰ کجا و زہد کجا و کجا صلاح

کیا جان میری جان کے درپے وہ ہو سکے
غمزہ سے تیرے پوچھے نہ جبتک قضا صلاح

اُس بد معاملہ سے بھلا کیا معاملہ
کس بد صلاح نے تجھے دی یہ دلا صلاح

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو
دیتا ہے ایسی کوئی بھی مردِ خدا صلاح

کرتی خراب اُسی کو ہے تیری نگاہِ مست
یا رب ہو دل کی خیر۔ کہ کچھ کر رہے ہیں آج

منظور اگر ہے قتل مرا غیر سے نہ پوچھ
قلّابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو

یہ ہی مرا رفیق ہے۔ یہ ہی مرا شفیق
جس کو کہ دیکھتی ہے نکو کار و باصلاح

چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا صلاح
ہے تو صلاحِ نیک میں کیا پوچھتا صلاح

اُس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح
لوں کس سے واں کے جانے کی دل کے سوا صلاح

اے ذوق جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح۔ وہی ہے بجا صلاح

خائے معجمہ

اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خوانین رامپور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے۔ پھر میرٹھ میں صدر الصدور ہو گئے تھے شعر و سخن کے شیدا تھے۔ اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ استاد مرحوم کا عالم جوانی۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعرا کی نشست نواب کے ہاں ہوتی تھی۔ اُستاد کی اُن سے شناسائی تھی۔ مگر وہ اُنہیں اُستاد مانتے تھے۔ شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے۔ اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملایا۔ اپنے شعر سنائے۔ اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ مُبصرانِ سخن کے نزدیک آج فن شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنو میں۔ شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں ؞

نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث۔ شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی۔ اور شاخ کی غزل سُنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اُٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر اُستاد کو بُلایا۔ حال بیان کیا۔ اور غزل کی فرمایش کی۔ اُستاد نے کہا۔ کیا حاصل؟ عبث کاہش ہے۔ اور انجام کاوش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو استاد نے

غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی۔ اور خلوۃ میں اتنا بھی کہا کہ ان قوافی کو اور اُن کے مضامین کو دیکھئے جو ان سے بڑھ کر کہیگا تو میں پھر دیکھونگا ٭ نواب نے کہا۔ ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اُس میں پڑھئے۔ یہ سُن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے۔ نواب نے سُن کر آدمی دوڑایا۔ وہ بریلی جا پہنچے تھے۔ آدمی نے جا کر پیغام پہنچایا۔ اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اُس زمانہ کا ایک مسوّدہ میرے ہاتھ آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے:۔

تھی زلف تیری سنبلِ صحنِ چمن کی شاخ
قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

اُس قد کو کیونکہ کہئے نہالِ چمن کی شاخ
لائیگی وہ کہاں سے ادا بانکپن کی شاخ

ابرو پہ اُس کی خال ہے کیا زاغِ شوخ چشم
سمجھا ہے اپنی شاخ نشیمن ہرن کی شاخ

دکھلائی اُس کے سرمۂ دنبالہ دار نے
آنکھوں سے ہم کو نرگسِ ہاروت فن کی شاخ

ناف اُس صبیح کی ہے کوئی نسترن کا پھول
تا ناف سیلی سینہ پہ ہے نسترن کی شاخ

دل باغِ عشق نخل۔ کہ جس میں ہزار ہا
حسرت کے برگ۔ الم کے ثمر ہیں۔ حزن کی شاخ

بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پُر جفا
ممکن نہیں کہ لائے ثمر کرگدن کی شاخ

کہتی تھی چوب تیشہ مری طرح ایک دن
سوکھے گی نخل آرزوے کوہکن کی شاخ

ن کہتی تھی چوب دستۂ تیشہ کی میری طرح

جب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لئے
ممنون باغ میں ہے نہایت رسن کی شاخ

لچکے ہے یوں کمر تری وقتِ خرامِ ناز
جنباں ہو جوں نسیمِ چمن سے سمن کی شاخ

حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروے یار پر
گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکہ ہرن کی شاخ

ہے جوش پارہ پارۂ دل ہر مژہ پہ یوں
لائے نکال کو پلیں جس طرح گھن کی شاخ

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار
ہے یہ بھی اُس کے ایک شجر مکروفن کی شاخ

دیتی ہے سر پہ بلبلِ آتش نفس کو جا
رکھتی ہے کیا چمن میں ہوس سوختن کی شاخ

ہے نعش تیرے کشتۂ بیکس کی دشت میں
گویا کہ اک نشیمنِ زاغ و زغن کی شاخ

جُز شمعِ استخوانِ صفا کیش زیرِ خاک
دیکھی نہ ہے کسی نے گلِ صبحِ کفن کی شاخ

نے برگ ہے نہ غنچہ۔ نہ گل ہے۔ نہ ہے ثمر
ہیں خشک طالعی سے ہوں گویا ہرن کی شاخ

ریشم کا لچھا ہاتھ میں اُس کے نہیں دلا
یہ یاسمن کا سانپ ہے وہ یاسمن کی شاخ

چھوٹے جلانے والوں سے وحشی نہ مر کے بھی
انجن کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

تشبیہ کیونکہ دوں مژہ خوں فشاں سے میں
مرجاں کی شاخ کب ہے بھلا اس پھبن کی شاخ

صیاد میں چمن سے ہوں مایوس۔ چاہیئے
چوب قفس بھی ہو تو نہالِ چمن کی شاخ

باریک ہیں بتاتے ہیں جس کو نری کمر
یا کوئی موے تن ہے و یا موے تن کی شاخ

گل خوردہ تن مرا دمِ روئیدگی مو
ہے آشیان بلبل گلشن وطن کی شاخ

دبوے خراشِ دل کو نہ کیونکر وہ نازنیں
رکھتی ہے خار سینکڑوں نازک[52] بدن کی شاخ

دکھلائے باغ میں قدِ رعنا جو اپنا تو
قمری کے حق میں دار ہو سروِ چمن کی شاخ

موذی کو سرکشی سے میسّر ہو اعتبار
نکلے ہے طول عمر سے مار کہن کی شاخ

ہوتی ہے وحشیوں پہ پس از مرگ بھی شکست
زور آزمائیوں کے لئے ہے ہرن کی شاخ

شاخِ نبات کو نئے قلیاں نہ منہ لگائے
ایسی مصاحبت ہے لگی اُس دہن کی شاخ

ہے فیض سے وقار کے میری نگاہ میں
جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ

آخر یہ دستگیری تیشہ نے پھل دیا
کی قطع نخل آرزوے کوہکن کی شاخ

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پر جفا
آخر کو زیر ارہ کٹی کرگدن کی شاخ

بیمار چشم دلبر آہو نگاہ کو
شاخیں بھی گر لگائیں تو لیکر ہرن کی شاخ

ہر صید کی کمر سی گئی ٹوٹ جس گھڑی
ٹوٹی کمان دلبر ناوک فگن کی شاخ

تاثیر بیکسی سے ہو سارا درخت خشک
ڈالے جو سایہ نعش پہ اس بے کفن کی شاخ

ہے سیب نے باغ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی
جب سے مشابہت ہے لگی اس ذقن کی شاخ

سوفار کا دہن جو ہوا خون دل سے سُرخ
تیر اُس کا بن گیا ہے گل خندہ زن کی شاخ

ن) فزوں تر ہوا اعتبار ۔

ن) تھی سیب باغ خلد کو کب اتنی آب و تاب و قدر - لیکن شباہت سے لگی اُس دہن کی شاخ ۔

[52] نازک بدن ایک قسم کا بیر ہوتا ہے اُس کے درخت کو بھی نازک بدن کہتے ہیں ۔

لکھ ذوق اُس کی مدح کہ جسکی ثنا سے ہے
سرسبز تیرے گلشن باغ سخن کی شاخ

وہ کون ؟ شاہ اکبرِ ثانی کہ جس کو روز — مجرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ
اُس کی دُعاے حرز پڑھے جوشِ غنچہ سے — تسبیح ایک لے کے عقیق یمن کی شاخ
کردے جو وہ نہال تو لائے ابھی نکال — پرویں کا خوشہ گاؤ سپہرِ کہن کی شاخ
بہرِ تصدق آئے زرِ گل کو لے صبا — کرنے لگے نثار گہر یاسمن کی شاخ
پہنچائے اُس کا مژدۂ صحت جو باغ میں — سجدہ میں بہرِ شکر جھکے نارون کی شاخ
ہمسر ہے آج خضر ارم سیر سے شجر — ہم قد ہے آج یوسفِ گل پیرہن کی شاخ
گرمیٔ عدل اُس کی اگر ہو ستم گداز — پگھلے برنگِ شمع ابھی کرگدن کی شاخ
مطلع وہ پر بہار لکھوں اُس کی مدح میں — مصرع کو جسکے سُن کے کٹے نسترن کی شاخ

تیرے بہارِ فیض سے نخلِ کہن کی شاخ
سرسبز یوں ہے جیسے کہ سرو چمن کی شاخ

تیرے سحابِ لطف سے سیراب ہو اگر — ہمسر ہو شاخ نخلِ ارم سے ہرن کی شاخ
شاہا یہ تیرا دستِ سخا باغ دہر میں — گویا کہ نکلی ہے کرم ذوالمنن کی شاخ
گر تیرا حفظ ہو چمن بندِ روزگار — آب مژہ سے سبز ہو سرو چمن کی شاخ
صرصر کا سارا خاک میں مل جاے زور شور — چھیڑے گر آشیانۂ مرغ چمن کی شاخ
دیکھے جو تیرا قوتِ بازو تو ٹوٹ جائے — وقتِ کشش کمان سپہرِ کہن کی شاخ
تیرے عصا کو اُس سے میں تشبیہ کیونکہ دوں — ہے شاخ صدرہ ایک چنارِ کہن کی شاخ
تاثیر تیرا زور ضعیفوں کو دے اگر — ٹوٹے نہ پیلتن سے بھی نازک بدن کی شاخ
بلکہ کمند مار کے ہاتھی کو کھینچ لے — خرطوم سے لپٹ کے بصورت رسن کی شاخ
منظور گر خزانہ میں ہو تجھ کو شاخ زر — طیارہ ہو وہیں زرِ خور سے کرن کی شاخ
ہاتھی کو تیرے چاہئے لکڑی تو دشت میں — خرطوم سے اُکھاڑ لے وہ کرگدن کی شاخ

دانتوں کو اس کے دیکھ ہو لرزاں بہ شکل بید
صد دیو کوہ پیکر و البرز تن کی شاخ

گلگوں سے تیرے بڑھ نہ سکے یک قدم صبا
ستو تازیانے مارے نہال چمن کی شاخ

ہو تیرا فیض اگر چمن آرائے باغ دہر
آب تبر سے سبز ہو نخل کہن کی شاخ

نالاں ہیں تیرے عدل سے خونریز اس قدر
مانند نے ہو گرم فغاں کرگدن کی شاخ

برسائے جبکہ لعل و گہر تیرا دست جود
محتاج ابر ہو نہ نہال چمن کی شاخ

شاداب آب لعل یمن سے ہو مثل گل
سیراب ہووے آب سے دُرِّ عدن کی شاخ

یاں تک ہے پاس شرع ترے عہد میں کہ اب
ساغر بکف نہ ہووے گلِ خندہ زن کی شاخ

پیدا ہو بادہ خوار کی تعذیر کے لئے
نخلِ کدو نے تاک بن صورت رسن کی شاخ

یہ ذوق کی دعا ہے کہ تا باغِ دہر میں
سرسبز شعر تر سے ہو نخل سخن کی شاخ

جبتک کہ ہووے گردنِ مینا کی طرح سے
نخلِ نشاط ساقیِ پیماں شکن کی شاخ

نخلِ حیات تیرا تر و تازہ ہو مدام
جوں موسم بہار میں نخل چمن کی شاخ

دال مہملہ

پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ اُن کی غزل لکھکر بیٹھے تھے۔ دل لگ گیا اور چند قافیئے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھتے نظر آئے۔ فرمایا۔ ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سُنائی :-

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا ہم نے گریہ کو اپنے کہ لگ گئی
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھینگے پھر ایک گھڑی دو گھڑی کے بعد

اُس لعل لب کے ہم نے لئے بوسے اس قدر
سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینہ سے ہر آہ بے اثر
لب تک جو پہنچی بھی تو چڑھی دو گھڑی کے بعد

کل اُس سے ہم نے ترک ملاقات کی تو کیا
پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

کہنا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک
غمّاز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی۔ شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُنکی جھڑی دو گھڑی کے بعد

پروانہ گرد شمع کے شب دو گھڑی رہا
پھر دیکھی اُسکی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر۔ دیکھ جلد آ
آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اُس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا
آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوق کس طرح
پھر تو نہ ٹھیرے پاؤ گھڑی دو گھڑی کے بعد

ایک قدیم الخدمت محمد بخش نام استادِ مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ بڈھا بھی تھا۔ مسخرا بھی تھا۔ سامنے بورچی خانہ میں سب کا اتالیق بنا بیٹھا رہتا تھا۔ اور باتیں بنایا کرتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ استاد مرحوم کی اور اُن کے والد کی خدمتیں کرتے کرتے وہ بھی ایک رقم ہوگیا تھا۔ سب کے کاموں کو اصلاح دیتا تھا۔ میں حد شباب میں پہنچ لیا تھا۔ پھر بھی اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جس طرح بچپن میں مجھے کھلاتا تھا اور ہنساتا تھا۔ استاد کا وہ عالم اب تک آنکھوں کے سامنے ہے کہ خاموش اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ کوئی بات اُسکی بھی کان میں جاتی ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی خوش ہوتے تھے تو ایک دو گالیاں بھی دیدیا کرتے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ایک آدھ دھول بھی لگا دیتے تھے۔ اُسے پُرانے استادوں کے بہت شعر یاد تھے۔ استاد مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے۔ جوانی میں سورج مکھی پر شعر پڑھا کرتا تھا ٭

ایک دن میں نے اپنے مطبع میں چرچا سنا کہ رات کو فلاں بازار میں سورج مکھی پر استاد ذوق کے نوکر نے بھی شعر پڑھے۔ بڈھا تھا۔ پھر بھی خوب پڑھا۔ اور شعر بھی خوب تھے۔ ایک بولا آخر استاد کا نوکر تھا صاحب۔ خوب کیوں نہ پڑھتا ٭

میں حسب معمول شام کو استاد کے پاس گیا۔ وہ حرم سرا میں گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ محمد بخش! کل سورج مکھی پر شعر پڑھے تھے؟ پہلے تو مکر گیا۔ پھر بڑی مشکلوں سے قبولا۔

میں نے پوچھا۔ کیا کیا پڑھے تھے؟ بڑے غمزوں سے سودا کی ایک غزل سُنائی۔ میں نے کہا استاد کے شعر بھی تو پڑھے تھے! کہا یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے۔ میں نے کہا۔ کون؟ کہا۔ یہی میاں ابراہیم۔ میں نے کہا۔ بھول کیونکر گئے۔ کہا۔ پہلے اچھے کہتے تھے۔ اب تو کچھ اَور ہی ڈھب کے کہتے ہیں۔ میں نے کہا خیر۔ جو شعر تو نے وہاں پڑھے وہ سنا دے۔ کہنے لگا۔ لڑکوں کے سامنے شعر نہیں پڑھا کرتے۔ میں نے کہا اچھا ایک ہی پڑھ دے۔ بڑی خوشامدوں سے یہ مطلع پڑھا:-

اُٹھے پہ ترے چمکے ہے جھُومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

اتنے میں استاد آئے۔ میں نے یہ مطلع سُنایا۔ فرمایا۔ تمہارے ہاتھ کہاں سے آیا۔ میں نے کہا محمد بخش نے ابھی پڑھا ہے۔ حضرت! آج رات کو سورج مکھی پر اس نے شعر پڑھے تھے۔ مسکرا کر بولے۔ کیوں بے گنجے فلاں فلاں تو ہمارے شعر سورج مکھی پر پڑھا کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو کوئی شعر اس کا یاد ہے۔ فرمایا۔ مُدّتوں کی باتیں ہیں۔ اب کہاں یاد۔ پھر کہا۔ یادداشت کے جُز میں لکھ لو۔ کتاب میں نہ لکھنا۔ میں نے کہا۔ حضرت! کیوں؟ فرمایا لڑکپن کی باتیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی فرمایش سے کہدیتے تھے۔ فرصت میں بیٹھیں گے تو اپنے رنگ میں لے آئینگے۔ میں نے وہی لکھ لیا۔

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک
دم گھُٹتا ہے سینہ میں دمِ شدّتِ گریہ

دیکھا نہ کبھی ہم نے دلِ اہلِ صفا بند
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہوا بند

ایک دن والدِ مرحوم کے پاس آئے۔ ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں۔ جن میں نہیں۔ ان کے لئے طرحیں تجویز ہوں۔ ردیف دال کے لئے یہ مصرع بھی طرح ہوا۔ ع

پنبۂ داغ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید

ذال معجمہ

۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اُس میں یہی طرح ہوئی تھی۔ شاگرد آئے اصلاحیں لے گئے مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں۔ دیکھکر فرمایا۔ دیکھو قافیہ کا پہلو نہیں بٹھا سکتے۔ زمین ماپتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام بے اصول تو نہ ہو ٭

مژدۂ قتل سے اُس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادیٔ تن کا کاغذ

گور میں پیش ہو جب دفترِ تن کا کاغذ
ہو سیاہ نہ کو سفیدیٔ کفن کا کاغذ

بن گیا عکس سے اُس شوخ گلستاں رُو کے
صفحۂ آئینہ۔ تصویرِ چمن کا کاغذ

کیا کرے خانۂ گینتی کا کوئی دعوے ملک
نام پر کس کے ہے اس قصرِ کہن کا کاغذ

لکھیں اُس چشم کے وحشی کے لئے گر تعویذ
اہل تکسیر کریں۔ پوست ہرن کا کاغذ

رقعہ شادیٔ شہادت کا ہو۔ خوں سے رنگیں
ایسی شادی کو ہو ایسی ہی پھبن کا کاغذ

سینہ صافوں کو زمانہ کے ہے ہاتھوں سے شکست
ہے صفائی سے سزاوارِ شکن کا کاغذ

ورق چرخ ہو گو نسخۂ آشوب۔ نہ ہو
سرمۂ چشم مہ سیم بدن کا کاغذ

یوں قفس میں کوئی ہم تک ہے پہنچتا گلبرگ
جیسے غربت میں شفیعتانِ وطن کا کاغذ

ظاہر آرا نہ کتابوں سے ہو۔ ڈر دوزخ سے
کر نہ آتش میں لباس اپنے بدن کا کاغذ

جعلسازی پہ زمانہ کی گواہی دے ہے
مہری و سادہ مہ چرخ کہن کا کاغذ

مہرہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آئے ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب اسکے دہن کا کاغذ

ذوق دلسوختہ دیواں لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیٔ سخن کا۔ کاغذ

حولِ دل کا مجھے کیا دیتے ہو لا کر تعویذ
اُس کا خط لاؤ کہ رکھوں میں بنا کر تعویذ

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج
لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بنا کر تعویذ

تم نے تعویذ نشانی جو دیا تھا اپنی ‌ ‌ لے گیا کوئی موکل وہ اڑا کر تعویذ
اب تلک جوش میں ہے خونِ شہید غم عشق ‌ ‌ دیکھ لو تم سرِ مرقد سے اُٹھا کر تعویذ
جلنوائی نہ پڑی یار میں اور غیروں میں ‌ ‌ سینکڑوں خاک کئے ہم نے جلا کر تعویذ

رائے مہملہ

نگہ نہیں۔ حرف دلنشیں تھا۔ دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
نکل کے رخنہ سے چشم فتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

ز: نکل کے آیا جو راہ آنکھوں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

پھر آیا لو وہ نگار خونی ادھر کو سرگرم جنگ ہو کر
کہ جس کے ہاتھوں سے اڑ گئے سر ہزاروں بیدھی کا رنگ ہو کر
وہ چشم مخمور اک نظر سے۔ چبھوئے لاکھوں جو نیشتر سے
تو ہو رواں ہر رگ جگر سے لہو۔ مئے لالہ رنگ ہو کر
جو رنگ الفت سے آشنا ہیں۔ وہ گر برے بھی ہیں خوشنما ہیں
کہ رنگ ہی سے گراں بہا ہیں۔ عقیق و یاقوت سنگ ہو کر
جو سمجھیں حسن بتاں کو ایماں۔ انہیں رہِ کفر و دیں ہے یکساں
پہنچتے کعبہ ہیں وہ مسلماں ہمیشہ چین و فرنگ ہو کر
صفای دل کی یہی ہے صورت۔ کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائینگے بالضرورۃ۔ اس آئینہ میں یہ زنگ ہو کر
غزال رم دیدہ بن گیا ہے۔ جو خواب آنکھوں میں۔ تو بجا ہے
کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پلنگ تجھ بن۔ پلنگ ہو کر
ہوئے جو یکرنگ۔ انکو زیبا۔ نہیں جہاں میں رعونت اصلا
کہ پایا گل نے ہے نام رعنا تو اس چمن میں دو رنگ ہو کر

حلاوتِ شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری
مزے سے گزری اگر گزاری کسی نے بے نام و ننگ ہو کر

خوب روئے رات ہم سنسان ہاموں دیکھکر
یاد آیا ہم کو مجنوں - بید مجنوں دیکھ کر

اُڑ گئے اک آن میں جادوئے بابل کے دھوئیں
سرمہ آلودہ تری چشم پر افسوں دیکھ کر

دیکھ کر غیروں میں مہتابی پر اُس مہوش کو رات
آہ کی اک دل سے ہم نے سوئے گردوں دیکھ کر

سچ کہا ہے - آگے کالے کے نہیں جلتا چراغ
چھپ گیا مہ رُخ پہ تیرے زلف شبگوں دیکھ کر

بل بے میرے ساغرِ سرشار وحشت کا نشا
چھپ گیا خم میں مری صورت فلاطوں دیکھ کر

آگئیں نم کو لگانی اُنگلیوں پر فندقیں
نوک مژگاں پر مرے اشک جگرگوں دیکھ کر

جو ہے نالہ اپنا - وہ اک مصرعِ برجستہ ہے
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قدِ موزوں دیکھ کر

قتل کو کس کے چڑھائی تیغ تو نے سان پر
اُترا آنکھوں میں جو زخموں کی مرے خوں دیکھ کر

لے گیا دل کون میرا - ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتادوں دیکھ کر

کہا پتنگ نے یہ - دار شمع پہ چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مرلے کسی کے سر چڑھ کر

مرے خیال پہ - وہ چشم فتنہ گر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ بنی - آئی لڑنے گھر چڑھ کر

دکھا نہ جوش وخروش اتنا زور پر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اُتر چڑھ کر

ستمگروں کی کشاکش میں آبرو ہو رسوا
کہ ہوتی سان پہ ہے تیغ تیز تر چڑھ کر

الٰہی خیر ہو مانند شعلۂ سرکش
پھر آیا باد کے گھوڑے پہ وہ ادھر چڑھ کر

ہنر شناس کو دکھلا ہنر - کہ خوبیٔ زر
اگر کھلے ہے تو صرّاف کی نظر چڑھ کر

کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا
کہ دور آپکو کھینچے ہے تیرے سر چڑھ کر

ترا مکاں تو ہے کیا - لامکاں میں کود پڑیں
امید وصل میں ہم - بام عرش پر چڑھ کر

جو مارے نفس کو - اور کرلے اپنے غصّہ کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ہماری خاک پہ برپا ہے ذوق فتنۂ حشر
سمند ناز پہ کون آیا فتنہ گر چڑھ کر

جاں ہوا یوں ہوئی اُس خال کا بوسہ لے کر
جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی گنکا لیکر

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا لے کر
چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لے کر

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب
تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑیگا بدلا لے کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لے کر

کھینچتی روز قیامت سے بھی ہے آپکو دور
تیری زلفوں کی بلائیں شب یلدا لے کر

مجھ سا مشتاق جمال ایک پاؤگے کہیں
گرچہ ڈھونڈوگے چراغ رخ زیبا لے کر

جبکہ دیکھا نہ ملا جھ میں کہیں میرا پتا
پھر گیا نامہ بر یار خط الٹا لے کر

رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ آئینہ رو
تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر

تیرے پرزے نہ کئے خط کی طرح اے قاصد
شکر کر چھوڑ دیا اس نے نوشتہ لے کر

میرے قدموں ہی میں رہ جائینگے جائینگے کہاں
دشت میں میرے قدم ۔ آبلۂ پا لے کر

واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائینگے ہم ۔ لاکھ تمنا لے کر

دیوان چندولعل مدار المہام دربار حیدر آباد نے کئی ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا ۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا ۔ حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ لکھکر بھیج دیا ۔ اور روپیہ نہ لیا ۔ میں نے ایک دن نہ جانے کا سبب پوچھا ۔ فرمایا ۔ پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے ۔ میاں ۔ وہاں جاتے ۔ خدا جانے کیا ہوتا ۔ اور کیا کیا نہ ہوتا ۔ اپنی دلی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے ۔ خدا کا شکر کیا اور یہیں بیٹھے رہے ؁

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑکر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑکر

طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑکر
پھر نہ اٹھا کوچۂ چاک گریباں چھوڑکر

کیونکہ نکلے تیر اس کا دل میں پیکاں چھوڑکر
جائے بیضہ کو کہاں یہ مرغ پراں چھوڑکر

لہ سنبھالا لینا ۔ بعض دفعہ بیمار قریب المرگ ہوتا ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے ایسا سنبھل جاتا ہے گویا اچھا ہو گیا ۔ سب کو صحت کی امید ہو جاتی ہے ۔ پھر دفعتًہ حالت بگڑ کر پہر دو پہر میں کام تمام ہو جاتا ہے اُس وقت کہتے ہیں کہ جو صحت معلوم ہوئی تھی وہ سنبھالا لیا تھا ؁

کام یہ تیرا ہی تھا۔ رحمت ہے اے ابرِ کرم
ورنہ جائے داغ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر؟

جس نے ہو لذت اُٹھائی زخمِ تیغِ یار کی
کب وہ مرہماں کو ڈھونڈے ہے نمکداں چھوڑ کر

صیدِ دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہے تو
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جاں چھوڑ کر

سرد مہری سے کسی کی آگے ہی دل سرد ہے
یاں سے ہٹ جا دھوپ اے ابرِ بہاراں چھوڑ کر

دیکھئے کیا ہو۔ کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

اے دل اُس کے تیر کے ہمراہ سینہ سے نکل
دیکھ پچھتائیگا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر

کیوں نہ رم کر جائیں آہو ایسے وحشی سے ترے
شیر بھاگیں جس کے نالوں سے نیستاں چھوڑ کر

سرخیِ پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اُٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر

پیش خیمہ لے کے نکلا گردِ بادِ دودِ آہ
ہے جو سرگرم سفر تن کو مری جاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

ساغرِ دل بیچتا آیا ہوں کھومٹ ہاتھ سے
چوکتا ہے کیوں یہ جنسِ دست گرداں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالم مضموں میں طرز نفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

میں وہ مجنوں ہوں جو نکلوں کنج زنداں چھوڑ کر
سیب جنت تک نہ کھاؤں سنگ طفلاں چھوڑ کر

پیوے میرا ہی لہو مانی جو لب اُس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے خونِ شہیداں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام۔ جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیِ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

ہو گیا طفلی ہی سے دل میں ترازو تیرِ عشق
بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراقِ میزاں چھوڑ کر

اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

شوق ہے اُس کو بھی طرزِ نالۂ عشاق سے
دمبدم دیکھے ہے منہ سے دود قلیاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے
باغ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

گھر سے بھی واقف نہیں اُسکے کہ جسکے واسطے	بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر
وصل میں گر مجھکو ہووے رویتِ ماہِ رجب	روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے **ذوق** پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

بندہ آزاد بھی ان دنوں حاضر خدمت ہونے لگا تھا۔ ایک دن مومن خاں صاحب استاد کے پاس آئے۔ اثنائے گفتگو میں کہا۔ آج کل کا کوئی شعر سنائیے۔ استاد نے فرمایا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں۔ جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقوم الذیل کا مطلع اُنہی دنوں کہا تھا۔ یہی سُنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کہیگا۔ رستہ بند ہے :-

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر	پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
کیا ڈھونڈے دشت گمشدگی میں مجھے کہ ہے	عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر
اُس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا	مرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر
ساقی بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی	خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر
خود اُڑ کے پہنچے نامہ۔ جو ہو مرغ نامہ بر	اُس شوخ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر
کرتا ہے دل کا قصد کماندار تیر اتیر	پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر

اے **ذوق** میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سُنا کہ اس میں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے استاد مرحوم سے پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا عالم شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر	ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ دفعۃً مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے خود اُس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہدیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دل کو

سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد یہ دی کہ وہ اس سے بھی زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔ پھر سب چپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے:۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

دل سینہ میں کہاں ہے؟ نہ تو دیکھ بھال کر
اے آہ۔ کہہ دے تیر کا نامہ[1] نکال کر

ہوں سرد ہو چکا۔ نہ دوبارہ حلال کر
مَیں! اور دم چراؤنگا۔ یہ تو خیال کر

عاشق کے خوں سے اپنا پرِ تیر لال کر
دکھلا دے شاخِ خشک میں کونپل نکال کر

تیرے مریض نے کئی نقلِ مکاں کئے
آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر

شہرگ پر اپنی زندگی و موت میں ہے لاگ
آ تیغ یار! قصّہ یہ تو انفصال کر

اُتریگا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے
خاکِ دلِ شکستہ نہ صرف اے کلال کر

لیکر بتوں نے جان جب ایماں پہ ڈالا ہاتھ
دل کیا کنارہ ہو گیا سب کو سنبھال کر

سینہ ہمارا وادیٔ وحشت سے اے جنوں
ہر داغ پر تصوّرِ چشمِ غزال کر

گر چاہتا ہے مثلِ مہ چاردہ فروغ
آ پھر کے شہر شہر میں کسبِ کمال کر

پوچھو چلے ہیں کونسے کعبہ کو اہلِ درد
ملکِ فنا ہے۔ جائیں ذرا دل سنبھال کر

تصویر ان کی حضرتِ دل کھینچ لائے گر
رکھ دینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قائل ہے کس مزے سے نمک پاش زخمِ دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوقؔ
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ٹال کر

[1] نامہ نکالنا۔ وہی مشہور عمل ہے جسے عوام اب بھی ناواں نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کچھ چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام کبھی صورت۔ کبھی اور اتا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کاغذ کے پرزوں پر نام لکھ کر۔ کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھ کر۔ کبھی تیر کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تیر میں بھی یہ اشارہ ہوتا تھا۔ کہ یہی چور کے کلیجے میں لگیگا۔ مطلب یہ ہے کہ اے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے دیکھ بھال نہ کر۔ ہاں اے آہِ دل تو تیر کا ناواں نکال کر بتا دے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (اے یار) ÷

استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے طبیعت سے واقف تھے۔ اہلِ دربار میں سے کوئی سُنا دیتا تو جو پسند آجاتا خوشی حضور کی تھی کہ یہ ہمارے نام سے مشہور ہو۔ چنانچہ اس پر خود غزل کہتے۔ اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسودہ استاد کے پاس بھیج دیتے کہ اصلاح دیدیں۔ اس حالت میں استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچا کر اُن کے شعر درست کریں۔ چنانچہ جب غزل مرتب کرکے حضور میں لے جاتے تو بادشاہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اسی طرح میں پھر ایک اور مسودہ بھیج دیتے۔ ابتدا میں ۲ ۳ دفعہ ایسا ہوا۔ استاد سمجھ گئے آخر یہ ہوگیا کہ جب ایسا موقع ہوتا۔ تو اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے۔ جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپکر آیا۔ تو مجھے یاد ہے والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھکر مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دیدی۔ لڑکپن کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی +

مزا چکھایا ہے کوہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دود آگیا زباں پر
خدنگ دنبالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر
کہ بوسہ اُس چشم سرمہ سا کا ہے مہر گویا مری زباں پر
لگا کے باتوں میں اُن کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہدیں ٹھکانا جس کا۔ نگے زمیں پر نہ آسماں پر
تپ محبت میں سخت جانی کا یہ اثر ہے دلِ طپاں پر
کہ شکل سوہان پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زباں پر
اُٹھائے سوزخم ہر نمط ہیں۔ یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل قط گیر خط پہ خط ہیں۔ ہنوز باقی ہر استخواں پر
خلش بھی خار خار غم کا رہا۔ تو مرقد پہ میرے سبزہ
یقیں ہے مانند برگ خرما اُگے گا نشتر لئے زباں پر

کہا یہ سو بار دل کو رو کر۔ حریف مت بن تُرک چشم کو کر
سو آخرش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔ بہا ہے مژگاں کی ہر سناں پر
وہ چشم ابرو تمہارے زیبا کہ۔ قاب قوسین جن سے ادنےٰ
یہ خال پیشانی کیوں تمہارا۔ نہ فرق لے جائے فرقداں پر
کہے ہے داغ جنوں کہ چمکوں۔ جو تیرے سر پر بہشت وا ہوں
چراغ وحشت سرائے مجنوں۔ کروں میں روشن چراغداں پر
بنا بگولے کو برج آسا۔ قریب ناقہ کے قیس پہنچا
پر اُترے محمل سے کیونکہ لیلےٰ۔ کہ پردہ کھلتا ہے ساربان پر

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو گئے لب پہ آتی
جو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی۔ ہمارے داغِ دلِ طپاں پر

جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون مرے چتون پر
میں کہوں میں۔ تو کہے۔ بس کہ چھری گردن پر
جو ترے دوست پہ تجھ بن ہے گذرتی ظالم
وہ مصیبت نہ ہو دنیا میں کسی دشمن پر
تیرے دندان مسی زیب کی دیکھی جو بہار
پڑ گئی اوس سی گلشن میں گل سوسن پر

اے دل وہ سرِ غمزۂ پنہاں عیاں نہ کر
آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر
آہوں میں دردِ دل جو نکالوں تو وہ کہے
او نفتہ جاں! ہوا ہو یہاں سے دھواں نہ کر

ایک غزل کے دو مطلع مجھے ایک مجہول آدمی نے سُنائے اور کہا کہ استاد کے ہیں۔ میں نے یاد کر لئے اور استاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا۔ اُہو۔ لڑکپن کے ہیں بھئی۔ بلکہ بچپن کے۔ اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کرینگے۔ وہ بھی عجب دن تھے۔ ہم مشاعرہ میں گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علیخاں سید۔ تشریف لائے۔ یہ بزرگ اس زمانہ میں اراکین مشاعرہ بلکہ اراکین شہر شمار ہوتے تھے۔ لوگوں

نے اُن سے کہا۔ اُنہوں نے پھر ہمیں پاس بلایا۔ دل بڑھایا۔ اور فرمایش کر کے دوبارہ غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نامۂ شوق کو مرے باندھے تو جو بال و پر
کیوں اے مرغ نامہ بر تجھکو ہوئے وبال پر

مصحف روئے یار میں دیکھا ہے سو جو خال پر
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

ہیں ہما کے سر پہ افسر اُن ہواگیروں کے پر
رل گئے جن طائروں کو ہیں ترے تیروں کے پر

اُن کو بے پر عرشِ اعظم پر اُڑاتے ہیں مرید
کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پیروں کے پر

شرح بختِ برگشتہ گر کروں رقم پھر کر
تیر بازگشتی ہو۔ ہاتھ میں قلم پھر کر

رکھ لیا اُس نے چمن میں گل جو سر پر توڑ کر
میں بھی حاضر ہوں کہا غنچے نے یوں منہ جوڑ کر

بعد مردن آچکے رونے کو سُن کر گور دور
جیتے جی کتنے ہو چل صورت تری در گور دور

دلِ شوریدہ سر نے خاک اُڑا کر
بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر

خفا تو ہو نہ وقت ذبح میرے تلملانے پر
کہوں کیا لوٹتا ہوں میں ترے بازو دبانے پر

سین مہملہ

یہ دو غزلہ انہیں مسودوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظر ثانی نہیں ہوئی تھی۔

کونسا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بیدم کے پاس
غم ہے اُسکے پاس ہمدم اور وہ ہے غم کے پاس

ہمکو بخشا گیا ساقی جو تھا جامِ جہاں بیں جم کے پاس
تھا اِدھر جام اُدھر اور تو ہو اُس پُر غم کے پاس

خط کہاں آغاز ہے پشتِ لبِ دلدار پر ہیں جنابِ خضر آئے عیسیٰ مریم کے پاس
مردمک کے پاس ہے یہ اشکِ خوں نہیں کا ہجوم؟ یا دھرے یاقوت ہیں یہ دانۂ نیلم کے پاس
روح اُس آتش بجاں کی بعد مردن جوں پتنگ آئیگی اُڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس
کس کی قسمت ہے کہ زخمِ تیغِ قاتل ہو نصیب جان سے جائیں۔ نہ جائینگے مگر مرہم کے پاس
کیا مزے لے لے کے گل کھائیں اگر آجائے ہاتھ یہ جو چھلا آپ کی اُنگلی میں ہے خاتم کے پاس
ن خاتمِ ملکِ سلیماں ہے اگر آجائے ہاتھ۔
زلف سے بے وجہ خطِ سبز ہم پہلو نہیں ہے لٹکتا عشق پیچاں سنبلِ پرخم کے پاس
واہ صیادِ اجل۔ اور واہ صیادی کا پیچ کھچکے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس
دیکھو فیاضِ ازل نے کیا دیا آنکھوں کو فیض کاسہ در کف ہو کے ہم آتے ہیں اُن کی نم کے پاس
ہے جو قسمت میں تو دریا بھی کبھی ہو جائے گا آلگا ہے اپنا قطرہ بھی کنارِ یم کے پاس

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل
بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اُس غم کے پاس

تیر و کماں ہے گرِ بُتِ ناوک فگن کے پاس آہ وہ قد خمیدہ ہے اُس خستہ تن کے پاس
شب جانِ زار رُک گئی لب پر دہن کے پاس پھر اُٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس
یہ جوئے خوں رواں نہیں۔ دیکھو ہے رو رہا تیشہ۔ سر اپنا رکھ کے سرِ کوہکن کے پاس
اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام پہنچوں کبھی لبِ بتِ پیماں شکن کے پاس
انگشتِ شمع کیوں نہ اُٹھے بہر فاتحہ یہ ڈھیر ہے پتنگ کا پائے لگن کے پاس
میں تو اسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو شب کیا ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس
چلکے گی تا بحشر ہماری لحد میں آگ چاک جگر میں دیکھنا چاکِ کفن کے پاس
ق
میں نے کہا کہ بوسہ نہیں دو! ادب سے ہیں لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہِ ذقن کے پاس
ہنسکر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں پہ آپ پاجاتا ہے کواں کسی تشنہ دہن کے پاس

اے ذوق صدقے جائیے بت کے خیال کے
کیا لے گیا اُڑا کے بتِ سیمتن کے پاس

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس
بدگمان وہم کی وارو نہیں لقمان کے پاس

چمن سے بعد ہیں جیسے سین و قاف قفس
قفس میں بند ہیں ہم جیسے فانے ناقفس

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اُس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے:۔

لب شیریں کو ترے جان کرے بس چشم نگس
بیٹھی نظروں میں پئے جاتے ہے بس چشم نگس

بوالہوس جیفۂ دنیا سے بھرا دل نہ ترا
تو نگس اور تری چشم ہوس چشم نگس

صاد مہملہ

سب مذاہب میں یہی ہے یہیں اسلام میں خاص
کہ جہاں عام ہے۔ ہوتا ہے وہاں عام میں خاص

ساغر دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے
دیکھ عکس رخ ساقی ہے اسی جام میں خاص

خضر! باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیوان جان بخش
ہے یہ خاصیت اسی کے لب دشنام میں خاص

شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصان خدا
خدمتی اُن کے ہیں جو زمرۂ خدام میں خاص

کام دن رات ہے عاشق کا ترے ناکامی
کر دیا تو نے لگا اس کو اسی کام میں خاص

عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن
یہ مرض کرتا ہے شدت انہیں ایام میں خاص

ذوق اسمائے الٰہی ہیں سب اسم اعظم
اُس کے ہر نام میں عظمت ہے۔ نہ اک نام میں خاص

ضاد معجمہ

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض
ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض

بحر و بر میں نہیں کس کو ہوس قطع و برید
ناخن شیر ہے خنجر دم ماہی مقراض

گُل کترتی ہیں ہزاروں تری آنکھیں کافر
ہے عجب طرح کی اک تیز نگاہی مقراض

کب زباں چلتی ہے اُن کم سخن گویوں کی
اُنکے مُنہ میں یہ زباں ہے کہ الٰہی مقراض

محضرِ خوں مرا سارا ہے کتر کر پھینکا — دی گئی اس ظلم کی محشر میں گواہی مقراض
پاس کیا قطع تعلق ہیں۔ کہ یکساں سمجھے — قطع میں جامۂ درویشی و شاہی مقراض

رشتۂ عمر کیا قطع سراسر اے ذوق
کھو سکی شمع کے دل کی نہ سیاہی مقراض

اس غزل میں ایک شعر اور بھی کہا تھا :-

اُڑتے پرزے ہیں جگر کے کبھی پڑھتا ہوں جو آہ — ہوتا حق میں ہے مرے مطلعِ آہی مقراض

اسے میں نے لکھکر تامّل کیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری ابتدا تھی۔ کچھ نہ بولا۔ فرمایا۔ آہی سبزواری بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا۔ کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں۔ ہم تو سب ہی کے لئے کہتے ہیں ؎

عین مہملہ

ذوق کیونکر ہوا اپنا دیواں جمع — کہ نہیں خاطرِ پریشاں جمع

قاف

پھر کر ادھر اُدھر بھی نہ اپنا گیا قلق — لفظِ قلق کی طرح سے یوں ہی رہا قلق

کاف

جو کھل کر اُن کی زلفیں بل آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آ کے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک
ہم اُنکی چال سے پہچان لینگے اُن کو برقع میں
ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک
یہ جتنے سرو ہیں۔ سب اُنکے قد پر زہر کھاتے ہیں
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک
مرا دل ایک۔ دوں اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں
کہ ہیں واں نو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک
سراپا شوق جائیں سر کے بل ہم جن کے جلسہ میں
مثالِ شمع وہ ہم کو جلائیں سر سے پاؤں تک

نہ ہوں بے پردہ۔ تو بھی وہ کھڑے ہو ہو کے شوخی سے
پھبن چلمن سے در پردہ دکھائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اِس لئے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پُتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سراپا پاک ہیں دھوئے جنھوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

مزا اُتنا ہی ذوق افزوں ہو۔ جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخم تیغ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

پھر تو آئے خیر سے ہم جا کے اُس مغرور تک
پر اُچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دُور تک

صفحۂ دہر پہ یکدل نہ ہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں، سو بھی ہے جُدا ایک سے ایک

گاف

پُرانی غزل ہے۔ ۷ شعر تھے۔ دو یاد رہ گئے۔ وہی لکھ دیتا ہوں:-

بینی و عارض و ابرو سے ہیں شاخ و گل و برگ
یوں عیاں اس چمن رو سے ہیں شاخ و گل و برگ

بینی اور وہ دہن خندہ زن اور نازک لب
لکھے گویا قلم مو سے ہیں شاخ و گل و برگ

لام

پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو نوالہ دہان مار میں دل

بغل میں جیسا مرا دل بغل کا دشمن ہے
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

نکل نہ جائے دم اضطراب سینہ سے
برنگ شعلہ کہیں۔ آہ شعلہ بار میں دل

ہمیشہ روزن سینہ سے کیوں ہے چشم براہ
اگر نہیں کسی مہوش کے انتظار میں دل

ترا سنگار بھی ہے وہ بلا کہ جاے گھر
پروئے زلف مسلسل کی تار تار میں دل

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل

بغیر مارے نہ چھوڑیگی دل کو کافر زلف
کہو یہ دل سے کہ جاے نہ مار مار میں دل

اگر نہ جبر کروں اختیار اے ناصح
تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل

اڑیگا مثل شرر ٹکڑے ہو کے سنگ مزار
رہا اگر یوہیں گرم تپش مزار میں دل

برنگ غنچہ پیکان و غنچۂ تصویر
ہوا شگفتہ نہ اپنا کسی بہار میں دل

فلک کے رنگ سے ظاہر ہیں ماتمی آثار
خوش اپنا کیونکہ ہو اس نیلگوں حصار میں دل

برنگ بیضۂ نوروز۔ نوڑے دل اس نے
ہزاروں۔ ایک ہمارا ہے کس قطار[1] میں دل

ہزار دشمن جاں سے ہے ایک دوست بُرا
جو پوچھو کون ہے وہ؟ میں کہوں ہزار میں دل

نہوتیں خلد میں حوریں تو رہتا خلد میں کون؟
لگے ہے صحبت خوبانِ گلعذار میں دل

یہ جسم زار ہے یا میرے پیرہن میں ہے تار
گرہ ہے تار میں؟ یا میرے جسم زار میں دل

اُٹھا بھی لائے اگر ہمنشیں مجھے اے ذوق
رہیگا میرے عوض میرا کوے یار میں دل

ن تم زار رنگ کی مانند اُڑا دیگا سنگ مزار -

ن اُٹھا تو لائے گا مجھے میرے ہمنشیں اے ذوق -

ازل سے یوں دل عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرش خدائے غفور کی قندیل

سمجھ وہ دُرِّ بناگوش نور کی قندیل
خجل ہے اختر صبح نشور کی قندیل

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے باب کمال ظہور کی قندیل

جہاں ہے خانۂ عشرت! جبھی ہو اس کا فروغ
کہ لٹکے اس میں سرِ پر غرور کی قندیل

رہے ہے جوں قمر منخسف سدا بے نور
سیاہ بختوں کے بالین گور کی قندیل

پڑے جو عکس ترا جام میں تو ہو روشن
حباب بادہ تجلّی سے طور کی قندیل

عیاں ہے یوں مرے روز سیاہ میں خورشید
کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

سوائے دل کے ہو ناریخ باغِ خلد سے بھی
کبھی پسند نہ اُس رشک حور کی قندیل

[1] قطار۔ بہار نوروز میں لوگ ہار جیت پر انڈے لڑاتے تھے۔ اسکے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی ۲۰۔ ۲۰۔ ۴۰۔ ۳۰ انڈے لے کر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑائے جاتا تھا۔ جس کا انڈا آخیر کو ٹوٹتا۔ اُس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا۔ اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ رسم ایران توران افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آئی تھی +

اُڑے جو آہ کے ہمرہ نکل کے پارۂ دل
ہوئے ہوا میں وہ صورت طیور کی قندیل

وہ تیر ہیں یہ مرے نالۂ قیامت زا
کہ اُن کے رکھنے کو لازم ہے صور کی قندیل

نسیم کیا ہے ۔ کہ روضہ میں نغمہ جانوں کے
نہ گل ہو باد سے آواز صور کی قندیل

سمجھتا قدر ہے ناقص کب اس غزل کی ذوق
یہ روشن آپ نے کیوں پیش کور کی قندیل

یہ غزل لڑکپن کی ہے ۔ نظر ثانی نہیں ہوئی :۔

دیوانہ ہوں ترا مجھے کیا کام کہ لوں گل
زیبائش سر کو ہیں مرے داغ جنوں گل

ہوں زیر قدم خار ۔ بہ سر داغ جنوں گل
چاہے ہے جنوں بوؤں سدا خار جنوں گل

میں کشتہ ہوں لعل لب پان خوردہ کا کس کے
نکلے ہیں مری خاک سے آغشتہ بخوں گل

سو ٹکڑے ہیں اڑی کے برنگ گل صد برگ
کیا دشت نوردی میں کترتا ہے جنوں گل

اُس گل میں نہ پایا اثر بوئے محبت
سو بار سنگھائے اُسے پڑھ پڑھ کے فسوں گل

ہے روشنی خانۂ دل ۔ سوز محبت
زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گل

پیکان تو ہے دلدوز ۔ سر سینہ ہے سوفار
اُس تیر سے ہے دل میں دروں غنچہ بروں گل

ن ۔ کھلا تن گلدوز سے ۔ ابر ابر غبار ۔

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے
گلدستہ سے بھی ہیں مرے ہاتھوں پہ فزوں گل

آئینۂ فلک میں ہے عکس چراغ دل
خورشید ہو نمود ہوا بل بے داغ دل

میم

عالم نوجوانی کی غزل ہے ۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقومہ الذیل طرح ہوئی ۔ آغاز شباب تھا ۔ ہم نے کہا کہ زمین تو گرم ہے ۔ مگر تاثیر ٹھنڈی ہے ۔ میر مشاعرہ نے کہا کہ خیر اب تو ہوگئی ۔ ہم نے کہا ۔ اچھا ہم تو دو غزلیں کہدینگے ۔ مگر دیکھنا سب کیا کہینگے ۔ جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آیا نالاں آیا ۔

شمع نازاں نہ ہو اک رات بہا آنسو گرم
برسوں ہاں آنکھ سے ٹپکا ہے مرے لوہو گرم

اے جنوں! ہے خبر موسم گل ہر سو گرم
دم تو لے لینے دے مجھ کو۔ نہ کر اتنا تو گرم

آتش رشک سے اس کاکل شکیں کے صبا
جل گیا نافہ میں اس درجہ ہوا لوہو گرم

آبلے سینۂ دریا میں ہوئے جل کے حباب
دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

اے صبا نکہت گل لے کے چمن کو پھر جا
کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے یہ خوشبو گرم

آتش حسن کا پتلا ہے تو اے رشک پری
تاب رخ تیری بھبوکا ہے بلا ہے تو گرم

توسن ناز ترا ہر قدم اے رشک غزال
کیوں نہ ہو تیز کہ رکھتا ہے مزاج آہو گرم

عبث ہوئی جل کے ہے خاک
کھینچے ہے دل سے پر اب تک نفس کو کو گرم

رجنوں کون ہو مجنوں کے لئے
گر نہ ہو گرمیٔ وحشت سے دل آہو گرم

ق

اتری ہو جو خنک دل کشتہ
ہووے گلگشت سے کیا اس کا دل اے گلرو گرم

م سے سوا اس کو لگے
ہمرہ باد سحر بوئے گل شب بو گرم

ق

سرد مہری سے رکھا اپنی خنک دل تو نے
گرمجوشی سے کیا تو نے بت دلجو گرم

اپنے کشتے کی کرامت کو ذرا دیکھ آکر
ایک پہلو ہے اگر سرد تو اک پہلو گرم

ذوق دل میں یہ تڑپ عشق۔ کلام ایسا خنک
عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

بل بے اے آتش غم۔ دل کو کرے یہ تو گرم
کہ زمیں پشت سمک تک ہو نہ پہلو گرم

لطف بوسہ نہ رہا۔ ہم پہ ہوا جب تو گرم
شربت قند دیا۔ کر کے پر آتش خو گرم

تن رہا یوں ہی تپ غم سے اگر گرم مرا
سیخ آہن کی طرح ہو گئے بدن پر مو گرم

نیشتر جل کے دہیں کشتۂ فولاد ہوا
نکلا یہ آتش سودا سے مرا لوہو گرم

کٹ سکا صید محبت کا نہ قاتل سے گلا
اس نے پتھر پہ یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

آتش دل سے پس از مرگ برنگ شعلہ
خاک عاشق سے نکلتا ہے گل خود رو گرم

مہروش بل بے ترے حسن جہانتاب کی تاب
رخ سے گرم آئنہ ہو۔ آئینہ سے زانو گرم

کیا کہوں نامۂ جانسوز کی اپنے تاثیر
جل گیا بس۔ یہ کبوتر کا ہوا بازو گرم

سرِ مجروح کو ٹھکرا کے گیا وہ۔ اور میں
چونکا اُس وقت کہ جب منہ پہ بہا لوہو گرم

دمِ خورشید کی رعشہ سے سپر جائے چھوٹ
کھینچ کر تیغ کو جب ہو وہ ہلال ابرو گرم

دلِ عاشق کے جلانے کا ہے سارا ساماں
بینی شعلہ ہے تری۔ رنگ بھبوکا۔ رو گرم

کونسا سوختہ جاں صبح سے ہے گرمِ فغاں
کہ ہوا آتی ہے کوچہ سے ترے گلرو گرم

ہم تو سنتے تھے سدا کُلُّ حمُوضٍ بارِدٌ
ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش ابرو گرم

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ہوتی نہ یادِ زلفِ نو خطِ شکستہ میں
لکھتے الف خطوں کی نہ پیشا[illegible]

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوش جنوں سے رہتے ہیں جو[illegible]

پائی نہ تیغ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربا[illegible]

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھل من مزید بھول
لائیں جو آہ کو شرر افش[illegible]

پاکوبیوں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید
پھر ہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

تم بھی نہیں جگر پہ رہی۔ اس قدر رہے
سرگرم سوزِ عشق کی مہمانیوں میں ہم

مطلب سے اپنے کون ہے آگاہ جز خدا
جو خطِ سرنوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

ہیں آئینہ میں صورتِ تصویرِ آئینہ
آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

ہو وہ عزیز سورۂ یوسف سے بھی سوا
لکھ دیں تری شبیہ جو کنعانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو۔ بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندہ یار سے
اب مر رہے ہیں اُس کی پشیمانیوں میں ہم

پردہ میں چشمِ مست کے سرخوش ہیں جو مدام
شربُ الیہود[1] کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

[1] شربُ الیہود۔ یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں کمزور رہتے ہیں۔ اور اسی واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں خوشحالی نہیں ظاہر کرتے۔ عیسائیوں سے زیادہ تر دبے رہتے ہیں۔ شراب بھی کم پیتے ہیں اور چھپ کر پیتے ہیں۔ اہلِ ایران نے شربُ الیہود اصطلاح ٹھہرا دی یعنی کم پینی اور چھپ کر پینی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے چشمِ مست کی یاد میں درپردہ سرخوش رہتے ہیں۔ گویا ہماری میخواری یہودیوں کی سی شرابخواری ہے ❖

اُس خالِ رخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق | ہندو اسیر دیکھیں ہیں دُرّانیوں میں ہم
سینہ کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں | مصروف زخمِ دل کی نمکسرانیوں میں ہم
بیمِ کدورتِ دلِ صیاد گر نہ ہو | کیا کیا اُڑائیں خاک پر افشانیوں میں ہم
دکھلائیں روزِ حشر کو بین السطور سے | اپنے سیاہ نامہ کی طولانیوں میں ہم

جا سکتے ضعف سے نہیں کوچہ میں اُسکے ذوق
بہجائیں کاش گریہ کی طغیانیوں میں ہم

نون

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں | جامِ شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط | ہو جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں
اُس زلفِ فتنہ زا کے لئے اے مسیح دم | کچھ دستِ شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں
زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں | اپنے خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں
سرعت ہے نبض کی رگِ سنگِ مزار میں | دل کی تپش کچھ اب بھی تپِ غم سے کم نہیں
وحشی کو تیری چشم کی مژگانِ ہر غزال | صحرا میں تیز ناخنِ ضیغم سے کم نہیں
ہوتی ہے جمع زر سے پریشانیٔ آخرش | درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں
ساقی ملے ہزار فلاطوں ہیں خاک میں | جو خم بنے ہے قالبِ آدم سے کم نہیں
اُس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا | لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں
شورابۂ سرشک میں ڈوبا ہوا ہے دل | تیزاب میرے زخم پہ مرہم سے کم نہیں
ہاتھوں سے تیرے پارۂ الماس زخمِ دل | مجھکو تو جلوۂ گل و شبنم سے کم نہیں

ر ہو جسکے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں ۔

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں قاتل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں | ابھی چھاتی مری تیروں سے چھلنی خوب نہیں

تشنۂ دشتِ محبت کے لئے اس لب سے
کوئی دنیا میں عقیقِ یمنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اُس عالمِ تصویر میں سب
اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں

چشم کہتی ہے تری جنبشِ مژگاں سے کہ دیکھ
سر پہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے۔ ہے کسی میخوار کا دل
محتسب دیکھ۔ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

تابِ دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب۔ مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت۔ تو بنی خوب نہیں

خلشِ خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ گل دعوے نازک بدنی خوب نہیں

اُٹھے ہی جائیگا اس دل سے دھواں آہ کے ساتھ
جب تلک جلنے کا یہ سوختنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گزرا
آج جو سرد نسیمِ چمنی خوب نہیں

(۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش ایک معزز شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا حضور سے بھی غزل کا وعدہ لیا۔ استاد مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ اُن سے بھی بہت کہا اور اقرار لیا۔ مطلب یہ تھا کہ آئینگے تو سینکڑوں آدمی سُننے کو آئینگے۔ مشاعرہ کو رونق ہو جائیگی شاہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے۔ غرضکہ مشاعرہ میں گئے۔ غالب مرحوم۔ مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے۔ حضور بالا بالا تشریف لائے۔ اور پسِ پردہ بیٹھے ؛

حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بڑے شائق سخن تھے۔ اور سخن شناس تھے۔ اُنہوں نے استاد سے کہا۔ کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ استاد نے کہا۔ بسم اللہ چنانچہ بموجب آئینِ مشاعرہ پہلے شمع مشاعرہ وسط مجلس میں رکھی گئی۔ ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس باادب بیٹھا اور حضور کی غزل سُنائی۔ داکثر مشاعروں میں یہ غزل خلیفہ اسمٰعیل مرحوم پڑھا کرتے تھے) ؛

استاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کے لئے کہتے تھے تو اپنی غزل اُس طرح میں نہ کہتے تھے۔ اور کبھی کہنی بھی پڑتی۔ تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑ جائے اب بھی نہ لکھی تھی۔ شمع سامنے آئی تو کہا۔ مجھے تو فرصت نہیں ہوئی۔ کیا کہوں غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب اور اور اشخاص نے فرمایش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھئے۔ سب نے بہت کہا تو میں ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ لیکر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی تعریفوں کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سُنائی نہ دیتا تھا۔ درو دیوار بول رہے تھے۔ ع

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں

حضور کی غزل جو اُس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ایک شعر اُس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولیگا۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو — ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

دلّی میں تو پشت خاندان زیر زمیں آباد ہے۔ سکندرہ میں اکبر۔ آگرہ میں شاہ جہاں۔ اورنگ آباد میں عالمگیر۔ اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی۔ پسند کہاں؟ رنگون۔ جلّ شانہٗ جلّ جلالہٗ

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں — اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
مردار ہیں وہ طائر سدرہ ہی کیوں نہ ہوں — تیر نگاہ یار کی جو دُور زد سے ہیں
خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ — روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں
وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمینا گ — بُنیاد میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں
جاں دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ — اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

لے غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی۔ مذکورۂ بالا شعر اُس کا جب مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپک پڑتا ہے۔ دیکھو! خانہ برباد کا واقعہ بھی اُسی پسند پر ہوا۔ کابل میں مُوا ہوتا۔ بابر دادا کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں مُوا ہوتا تو اورنگ آباد میں عالمگیر کا مقبرہ تھا۔ اکبر آباد بھی دار السلطنت تھا۔ وہاں مرتا شاہجہاں کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا وہاں مرتا اکبر کے دامن میں سوتا۔ لاہور میں آن مرتا جہانگیر کی خوابگاہ حاضر تھی۔ موا تو کہاں؟ رنگون میں۔ خدا مغفرت کرے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا۔

لاشے کو دفن کیجئے۔ یہ کہ پھینک دیجئے
مُردہ بدست زندہ جو چاہئے سو کیجئے

چشم ثمر ہے سرو سے اُن کو جو بے وقوف
رکھتے امید دوستی اُس سرو قد سے ہیں

دو گالیاں کہ بوسہ۔ خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں ردّ و کد سے ہیں

بر میں خنک دلوں کے ہو گر خرقۂ فقیر
سمجھو کہ کرتے برف کی پوشش نمد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یار
بہتر سمجھتے ہم اُسے عمر ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یاں روشِ نشۂ شراب
ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ہر چند ناتواں ہیں۔ مگر رکھتے دل قوی
ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

جا ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری۔ عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغ عشق
ہم کرتے ذوق عشق کا دعوےٰ سند سے ہیں

ہے چشم تیری مست۔ قدح گیر باغ حسن
عارض پہ خط ہے طوطی تصویر باغ حسن

ہو جاتا دل ہے بیٹھ کے خود گلگر خوں ہیں گل
تاثیرِ باغ خلد ہے تاثیر باغ حسن

تحریر سرمہ ہے تری آنکھوں میں وقت خواب
اے غیرتِ چمن۔ در و زنجیر باغ حسن

پان و مسی و سرمہ و رُخ ہونگے لالہ زار
مشاطہ باغباں ہے بہ تدبیر باغ حسن

تبخالہ لب پہ گرمیٔ بوسہ سے ہے کہاں
ہے گلرخو! یہ غنچۂ دلگیر باغ حسن

اے رشکِ باغ طاقِ دو ابرو کا تیرے عکس
دریائے آئینہ میں ہے تعمیر باغ حسن

سیر خزاں جو چاہے تو اے ذوق دیکھ لے
اُس نازنین کا جلوۂ تغئیر باغ حسن

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے۔ اور دل کے ہم بس میں

کبھی ملنا۔ کبھی رہنا الگ مانند مژگاں کے
تماشا کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص آپس میں

توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمار ہجراں کی

نہ جنبش نبض میں جس کے۔ نہ گرمی جس کے ملمس میں
دکھائے چہرہ دستی آہ بالا دست گر اپنی
تو مارے ہاتھ دامانِ قبائے چرخ اطلس میں
جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیال بیت ابرو میں
وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں
کرے لب آشنا حرف شکایت سے۔ کہاں یہ دم؟
ترے محزونِ بے دم میں۔ ترے مفتون بیکس میں
ہوائے کوے جاناں لے اُڑے اس کو تعجب کیا
تن لاغر میں ہے جاں اس طرح۔ جس طرح بُو خس میں
مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے
ہزاروں دے چکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضموں ذوق ایوانِ دو عالم میں ہوئے موزوں
حواسِ خمسہ ہیں انساں کے وہ بندِ مخمّس میں

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم اُن کی زلف سے سودا جو وام لیتے ہیں
ترے خرام کے پَے رو ہیں جتنے فتنے ہیں
شبِ وصال کے روزِ فراق میں کیا کیا
ترے اسیر جو صیاد کرتے ہیں فریاد
ہم اُنکے زورکے قائل ہیں۔ زور بازو میں
جھکائے ہے سرِ تسلیم ماہ نو۔ پر وہ
ترے قتیل بتاتے نہیں تجھے قاتل
قمر کا داغ بھلا آئے کس حساب میں واں

ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
تو اصل و سود وہ سب دام دام لیتے ہیں
قدم سب آن کے وقتِ خرام لیتے ہیں
نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیر دام لیتے ہیں
جو عشق میں دل مضطر کو تھام لیتے ہیں
غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
جب اُن سے پوچھو اجل ہی کا نام لیتے ہیں
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقتِ مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانہ میں — شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانہ میں
میں ہوں وہ خشتِ کہن مدت سے اس ویرانہ میں — برسوں مسجد میں رہا۔ برسوں رہا بتخانہ میں
مستی و نا آشنائی وحشت و بیگانگی — یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانہ میں
میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب — جوشِ کیفیت سے میری خاک کے پیمانہ میں
ہوش کا دعویٰ ہے بیہوشوں کو زیرِ آسماں — خم نشیں ہیں مثلِ افلاطوں سب اس خمخانہ میں
پتھروں میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق سیلِ آب — پوچھو کیا لے جائیگی آکر مرے ویرانہ میں
عشق کو اے حسن اگر نشو و نما منظور ہو — سبز نخلِ شمع ہو خاکسترِ پروانہ میں
برقِ خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانہ میں
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق — زلف واں شانے نے کھینچی درد ہے یاں شانہ میں

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے
ذوق ہر بت قابلِ بوسہ ہے اس بتخانہ میں

اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
علم جس کا عشق۔ اور جس کا عمل وحشت نہیں — وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں
خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک — پر ہمیں زیرِ فلک سر منزلِ راحت نہیں
بسملِ تیغِ محبت کا لبِ ہر زخمِ دل — ہو نہ وا۔ بے شورِ واویلا و واحسرت نہیں
منہ میں گر پانی چوا دے یار اپنے ہاتھ سے — مرگ کی تلخی سے شیریں تر کوئی شربت نہیں
دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال — چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں
کہتے ہیں مرجائیں گر چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے — پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں
ایک حسرت تو برستی ہے کبھی برسی کے دن — ورنہ روتا ابر بھی اپنے سرِ تربت نہیں
ہے نوشتہ میں ترے بیمار کے صحت کہاں؟ — اس کے نسخہ میں دوا کے لفظ کو صحت نہیں

کھا کے زخمِ تیغ قاتل جو بجالائے نہ شکر
خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
خانۂ ہستی کا اپنے صحن ہے دشتِ عدم
میری وحشت پاؤں پھیلائے تو پھر دو نو جہاں
ایک دل اور اُس پہ اتنے بارِ غم۔ اللہ رے دل

کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں
ایک ساعت مثلِ ریگِ شیشۂ ساعت نہیں
روز کرتے چہل قدمی مگر فرصت نہیں
ہوں اگر یک عرصۂ میداں تو کچھ وسعت نہیں
اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

ذوق اس سوزنکدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صوزنگر کی بے صورت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو!
واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
حرف آیا جو آبرو پہ مری
مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
تجھ کو رسوا کرینگی خوب اے دل
جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
جامِ مے لب سے تو لگا اپنے
سُنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف

ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں
دلِ خانہ خراب کی باتیں
کر شراب و کباب کی باتیں
ہیں یہ چشمِ پر آب کی باتیں
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
تیری یہ اضطراب کی باتیں
سُن کے ناصح جناب کی باتیں
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں
کس مزے سے عتاب کی باتیں
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ایک موقع پر دو فرقوں میں اختلاف کا رنگ بگڑا۔ استاد نے ایک فرقہ کے لوگوں کو حق بجانب دیکھ کر طرفِ ثانی کے سرگروہوں کو سمجھایا۔ مگر وہ اپنی جمعیت اور کارسازیوں کے گھمنڈ میں تھے۔ نہ سمجھے ذقلعہ میں اُن نابکاروں کی کارروائیاں دیکھ کر زمانہ کے اہلِ ظرافت

ز رفعت

ز [illegible] خفقان

کہا کرتے تھے کہ ۱۲ ٹوپی جمع ہوگئی ہے یعنے قلعہ پر قیامت آئی) جب نصیحت کے نوشدارو نے مزاجوں کی اصلاح نہ کی۔ ناچار استاد نے بھی معمولی رفتار سے قدم بڑھایا۔ اور چند جلسوں میں جو عطر مطلب تھا۔ بادشاہ سے عرض کیا۔ اثر بھی اس کا اتنا بڑا ہوا کہ حکماً قلم اور زبانیں بند ہوئیں۔ چند روز میں ایسی ہوا چلی کہ ساری ٹوپیاں اُڑ گئیں اُنہی دنوں میں اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ دیکھو ہمارے بزرگ کسی طلسم کو توڑتے بھی تھے۔ تو اتنے ہی دائرہ میں پھیلتے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ ایک آج ہے۔
لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ العَلِیِّ العَظِیمِ۔

ہے جی میں اپنے غرہ جوہر کو توڑ دوں
آئینۂ خیال مُکدّر کو توڑ دوں

دنیا سے ہیں اگر دلِ مضطر کو توڑ دوں
سارے طلسم وہم مُکدّر کو توڑ دوں

میں کاٹ دوں پہاڑ کو۔ پتھر کو توڑ دوں
پر کیونکہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں

کیا دور جام ہو۔ جو کہے سر پہ دور چرخ
گر چاک پر پھرے تو میں ساغر کو توڑ دوں

دشتِ جنوں میں میں جو اُٹھایا ذرا قدم
پائے رفیق وہمت رہبر کو توڑ دوں

کیا دشمنی ہے اہلِ کرم سے۔ کہے ہے چرخ
یاں تک جُھکاؤں شاخ ثمرور کو توڑ دوں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشۂ و ساغر کو توڑ دوں

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ہر موج بحر عشق کو یہ بل ہے۔ بل بے زور
کہتی ہے دست و پائے شناور کو توڑ دوں

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

اے آشنا نہ پوچھ گرانباریٔ گناہ
کشتی میں ہوں تو بوجھ سے لنگر کو توڑ دوں

پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سر نشتر کو توڑ دوں

گذرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ دخانی میں

رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

وفور اشک اگر سر بہ اوج ہو اپنا
فلکِ برنگ گل نیلوفر ہو پانی میں

لگاتے تہمت گریہ ہیں دل جلوں کو ترے
یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں

کہوں میں اپنی کہانی تو وہ یہ کہتے ہیں
بغیر جھوٹ نہیں اور کچھ کہانی میں

نگاہ کس کی چڑھا دل کہ خوف سے دن رات
گذرتی ہے مجھے دل کی نگاہبانی میں

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اس جہان فانی میں

نہیں خضاب سے مطلب۔ مگر یہ موے سفید
سیاہ پوش ہوئے ماتمِ جوانی میں

وہ سیدھے گھر کو سدھارے ولے ہم انکے کھوج میں ہم
پھرے بھٹکتے ہوئے کوے بدگمانی میں

مصوّروں سے کہو دیکھیں چین ابروے یار
کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں

مزا ہے تیغ محبّت کے زخم کھانے کا
کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک فشانی میں

نہیں جو ضعف سے دم دل سے یہ کہے ہے آہ
کہ بس نہ دے مجھے تکلیف ناتوانی میں

ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ بقا میں فنا
حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق
تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں

تو کہے غنچہ کہ اُس لبؑ دھڑی خوب نہیں
چپ! کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

سامنے سے مرے ٹلتا نہیں ناصح جب تک
مغز کھاتا مرا دو چار گھڑی خوب نہیں

فتنہ سرکش ہے جبھی تک کہ تری آنکھوں نے
دست مژگاں سے کوئی دھول جڑی خوب نہیں

منہ چڑھے تیغ غم عشق کی۔ کیا منہ ہے ترا
بُوالہوس تجھ پہ کوئی ضرب پڑی خوب نہیں

خوبرویوں سے بہت آنکھ لڑی پر افسوس
قسمت اے ذوق کہیں اپنی لڑی خوب نہیں

مطلعٔ مرقومہ حاشیہ کو استاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ فرمایا ”سودا کے ایک مطلع سے بہت ملتا ہے۔ لڑکپن میں خدا جانے کیونکر ہو گیا تھا“

۵۱ گُہر کو جوہری صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا۔ اہل تالیف بیچاروں کو کیا خبر۔ سب کو خدا مغفرت کرے *

سلام کرتے ہیں اُن کو جدھر کو دیکھتے ہیں
اور اُن کو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبّت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
انہیں تو دیکھیں ذرا۔ وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی بُرِش تیغِ نظر کو دیکھتے ہیں
ہم اُن کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

نہ خیر و شر کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
جدھر کو آپ نہ ہوں ہم ادھر کو دیکھتے ہیں

بس چپکا دیکھ رہا ہوں جگر کے داغوں کو
کہ چارہ گر انہیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اُن آہوؤں سے کہو دیکھیں میری آنکھوں کو
جو آب جو میں گلِ نیلوفر کو دیکھتے ہیں

ہے اُن کی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم
جدھر ہو اُن کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

ہماری وصل کی شب ہے وہ یا شبِ محشر
کہ اُٹھ کے صبحِ قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

ہوا کے گھوڑے پہ کس بُرق وش کو دیکھا تھا
کہ طمطراق پہ ہم کرّ و فر کو دیکھتے ہیں

پڑیگا سایۂ زلف اُس پہ بھی ضرور کبھی
کہ پیچ و تاب تمہاری کمر کو دیکھتے ہیں

ہم اُن کے کوٹھے پہ چڑھکر ہیں ڈھونڈتے مہ عید
کدھر کو چاند ہے اور ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

خدا کا بندہ ہو زاہد خدا کو دیکھ ذرا
کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں

اُدھر شفق میں ہے شام اور ادھر ہمیں دیکھو
ابھی سے دمبدم اُٹھکر سحر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھو شغل اسیری میں ہم غریبوں کا
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

وہ دن تو عید کا ہوتا ہے دن ہمارے لئے
تمہارا اُٹھ کے جو منہ ہم سحر کو دیکھتے ہیں

یہ کس کو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھا کر
پڑا زمیں پہ جو نورِ قمر کو دیکھتے ہیں

سوال جوہر آئینہ ہے یہ چشم پر آب
کہ منہ پہ خاک ملے کیوں ہنر کو دیکھتے ہیں

بہار کو ہیں دکھاتے ستارہ سحری
تمہارے کان میں جب ہم گہر کو دیکھتے ہیں

فنا کی راہ میں پتھر جو بن کے بیٹھے ہیں
اُنہی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں

وہ خاک اُڑائینگی بازار عشق میں آ کر
کہ پہلے آن کے سود و ضرر کو دیکھتے ہیں

* جب اپنے رونے میں سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں - دھوئیں پہ اُڑتا ہوا خشک و تر کو دیکھتے ہیں

بنا کے چشم کے دنبالہ پر وہ خال سیاہ
سنان ترک نظر پر سپر کو دیکھتے ہیں

عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اُس رخ پر
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں

الٰہی آگ یہ سینہ میں ہے کہ آفت ہے
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

زیادہ سر ہو جو دشمن تو ہم سمجھتے ہیں
تڑپتا خاک پہ مار دو سر کو دیکھتے ہیں

نگیں کو دیکھ لیں چاہیں جو نام عالم میں
کہ سینہ کاوی ہیں یاں نامور کو دیکھتے ہیں

خراش ناخن وحشت سے چارہ گر میرے
شکستہ بخیۂ زخم جگر کو دیکھتے ہیں

اُٹھائی آنسوؤں نے کس پہ آج ہے تسبیح
سفر ہے جاں کا جو فال سفر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوش مژگاں سے بر سر مژگاں
ٹپکتا قطرۂ خون جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

دکھا دو تم لب میگوں پہ خندۂ نمکیں
کہ یاں تو ساغر مے میں شکر کو دیکھتے ہیں

عیار نقد محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

کسی دوست نے فرمایش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے۔ آپ بھی غزل کہئے۔ آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جابجا چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنّت آرامگاہ اُن دنوں بادشاہ تھے۔ انہوں نے فرمایش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو ہمیں خود آکر وہ غزل سنائیں۔ یہ ولیعہد یعنے مرزا ابوظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ایک قصیدہ اُن کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا۔

مے ملا کر ساقیان سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

زلف افعی وش کو دھو دے گر وہ پر فن آب میں
ہوں بجائے موج پیدا مار رہزن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا۔ پائے نگاہ
اِس طرح جاتے ہیں دیکھا! پاک دامن آب میں

پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اب بھی گریہ سے مجھے فرصت نہیں فوّارہ وار
گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

طاس قلیاں میں رکھا ہے اُس نے ابرِ مردہ کو
ڈوب مر رو رو کے تو اے ابرِ بہمن آب میں

دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پہ اُسکے وقتِ خواب
برج آبی میں ہے مہ۔ یا مہرِ روشن آب میں

بن ہو وہ تفسیدہ دل کر جائے اک دریا کو جذب
رگ پڑے گر ذرہ میری خاکِ مدفن آب میں

یوں رہا ہیں زندگی بھر تشنۂ دیدارِ یار
جیسے مستسقی کا دم ہوتا ہے مردن آب میں

سایۂ سروِ چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشکِ گلشن آب میں

وعدہ ہے آنے کا اُسکے ابر کھل جائے تو آئے
ڈالتا ہوں سبدم اُٹھ اُٹھ کے روغن آب میں

شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اُمڈے یہ اشک
بہہ گیا خط لکھتے لکھتے مشقِ من آب میں

ذوق تو اس بحر میں ایسے گلِ مضموں بہا
جا بجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

ہووے نوائے مہر وش جب پر توافگن آب میں
ہو سراپا فلسِ ماہی ماہِ روشن آب میں

عکسِ زلفِ یار اور آئینۂ رخسارِ یار
کھینچے ہیں شام و سحر تصویرِ سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہو گیا اے شوخ پرفن آب میں

مردم دیدہ ہیں اپنے زندہ آبِ اشک سے
مردمِ آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں

بھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بہے اے طفل کودن آب میں

تو لبِ دریا ہنسے آکر جو اے رشکِ بہار
ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

لے لو اپنے روئے سیمیں پر ذرا آبی نقاب
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا۔ کیا سبزہ ہے۔ کیا گل ہے۔ کیا ابرِ بہار
لطف ہے گر ہووے فیضِ ربِّ ذوالمنن آب میں

مدح کر اُس شاہِ دریا دل کی اے دل جس کا فیض
لعل و گوہر ہے بہاتا وقتِ گفتن آب میں

شاہ اکبر خسروِ غازی کہ آبِ تیغ سے
رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بگردن آب میں

پڑھکے بسم اللہ مجریہا و مرسیہا ولا
جوں شناور پھر ہوا ہیں دست و پا زن آب میں

مطلعِ روشن لکھا جس سے کہ بحرِ نظم میں
صورتِ اخترِ دُرِ معنی ہیں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو جبکہ توسن آب میں
نورِ حق ہو اہلِ برہاں پر مبرہن آب میں

اے شہِ الیاس رتبت - اے شہِ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

نام حق لیکر جو مارے تیغ راہِ حق ہیں تو
غرق جوں فرعونیاں ہو فوج دشمن آب میں

نوشۂ دریا نوال - اور دل ترا موجِ کرم
ہے سخاوت سے تری دستِ قلمزن آب میں

تیرا نیسانِ عطا جسدم گہر باری کرے
گوہرِ تر سے بھریں جوں کئے دامن آب میں

حکم تیرا جستجو چاہے تو گم ہونے نہ پائے
مثلِ ابراہیم ادہم ایک سوزن آب میں

تیرے حکمِ شرع سے جب کفر دریا برد ہو
غرق ہووے تا بہ انشاے برہمن آب میں

ہو ترے سینہ میں جب بحرِ معانی موج زن
قطرہ سے روشن ہو صد معنیِ روشن آب میں

ہو ترا فیضِ سخن گر معنیِ نطقِ فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوازن آب میں

تیرے آگے گر کریں اعدا سرِ عصیاں بلند
مثلِ قومِ نوح ہووے سب کا مدفن آب میں

توصف آرا ہو جو دریا میں تو ایک اک کرمِ آب
ہو عدو کے قتل کو سو سو تہمتن آب میں

روے دریا پر بناتے ہیں بہم موج و حباب
بہر سربازانِ لشکر خود و جوشن آب میں

نور ظلمت ہمدگر دشمن ہیں پر حیران ہوں میں
تیرے خنجر میں ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں

ق
بادپا تیرا ہے یوں آتش قدم بر روے خاک
ہووے جوں برقِ درخشاں سایہ افگن آب میں

عکس ابھی دریا میں ہے! درسن سے اُڑ جاتا ہے یوں
روح گویا اُڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں

تیرا فیلِ کوہ پیکر بسکہ دریا سپر ہے
ڈالے وہ کوہِ رواں جب اپنا دامن آب میں

مثلِ ابر آئے ولیکن سرعتِ رفتار سے
اوپر اوپر جائے مثلِ ابرِ بہمن آب میں

نسرِ طائر نسرِ واقع چرخ پر تا ہوں شہا
اور زمیں پر ہووے تا ماہی کا مسکن آب میں

ہو ہواے شوق میں سر پر ہما اقبال کا
ماہیِ دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

طرح مشاعرہ کی غزل ہے جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی :-

غمنامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شور الغیاث صریرِ قلم نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ ستم پر ستم نہیں
گریہ ستم ہیں روز تو اک روز ہم نہیں

مضموں کے پیچ و تاب سے تاب رقم نہیں
ہے زلف یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں

بعد از فنا بھی جوش جنوں میرا کم نہیں
کس وقت زلزلہ سر دشتِ عدم نہیں

گو اضطرابِ دل کو عیاں کرتے ہم نہیں
پر جو نگاہ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں

جوشِ شگفتگی ہے محبت کا غم نہیں
یہ خوں خراش دل میں تبسم سے کم نہیں

آتش میں آپڑا تو ہے میری طرح سپند
لیکن نکل بھی جائیگا ثابت قدم نہیں

یہ دل مجھے ڈبو کے رہیگا کہ سینہ میں
وہ کونسا ہے داغ جو گرداب غم نہیں

منظور دل کو کاوشِ غم کی ہے مشق اگر
بہتر مژہ سے یار کی کوئی قلم نہیں

ہیں آمد بہار سے بھرلائے منہ میں خوں
یہ زخم دل تبسم غنچہ سے کم نہیں

ہم کافرانِ عشق کو ہے یہ بڑا عذاب
دوزخ میں آتش آتشِ سنگِ صنم نہیں

مجھ روسیہ سے کب نہ ہوا سجدہ سرفرو
کب گردن خجالتِ محراب خم نہیں

مشکل ہے میرے عہد محبت کا ٹوٹنا
اے بے وفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اہلِ صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر
گوہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

وحشی کو تیرے دشت بھی ہے عرصۂ بہشت
آہو کی شاخ شاخ سے طوبےٰ کے کم نہیں

اللہ رے ضبطِ دل کہ مری بر سرِ مزار
گیسوئے دودِ شمع میں بھی پیچ و خم نہیں

اے عہد یار ہے تو زمیں پر کہ اُٹھ گیا
ڈھونڈوں کدھر سراغ کہ نقشِ قدم نہیں

منصوبہ مارنے کا مرے کرتے ہیں حریف
اور مجھ میں شل بازیِ شطرنج دم نہیں

تو نے جو ہاتھ قتل سے کھینچا تو کیا ہوا
رکتی کسی طرح تری تیغ ستم نہیں

ہے میکشوں کے واسطے میخانہ تختِ جم
یاں جام مے ہے سامنے گر جام جم نہیں

چمکا یہ آتشِ دلِ پروانہ کا ہے رنگ
اے شمع روعیاں شفقِ صبحدم نہیں

ہے لوث حبِّ زر سے یہ دامن ہمارا پاک
گر چھینٹ بھی پڑے تو بجدِ درم نہیں

گر آب دیدہ شربتِ کوثر بھی ہے تو کیا
جب تک کہ اس میں چاشنیٔ دردو غم نہیں

حالت ہے اب یہ زار ترے دلفگار کی
ہے چشم زخم منہ پہ کہ جو چشم نم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دلِ گم شدہ کا کھوج
ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

ہاتھوں سے چرخِ تفرقہ پرداز کے کبھی
کر سکتے آہ دستِ تاسف بہم نہیں

سر بازِ عشق کے لئے دارالاماں کہاں
محفوظ قطع سے سیرِ شمع حرم نہیں

جاتا ہے آنکھیں بند کئے ذوق تو کہاں
یہ راہ کوے یار ہے راہِ عدم نہیں

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی (دیکھو صفحہ ۱۱۲) کشش کی مقناطیس بہت لگائی مگر استاد نے بھی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے۔ اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں وہی دیوان ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے۔ انہیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے انہی کی زبان سے نکل گئی تھی۔ حکیم کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے مگر خلیفہ صاحب کے سبب سے کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انہیں خدمتیں سپرد نہ کردیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے۔ اسی لئے مرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا۔ حالانکہ استاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے کسی معاملہ میں کبھی دخل ہی نہیں دیا:۔

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اُس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

جیتے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے ادھر سے جبکہ چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیسا مومن کیسا کافر۔ کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُس کے سَو سَو داغِ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دل میں رہوں میں! جلوۂ جاناں کہتا ہے میں!
کس کو نکالوں کس کو رکھوں! یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

بحر میں موتی پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں
دیکھو! لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر
دل کا ذکر رہا کیا باقی۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں

حضرتِ دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اُٹھائے دنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جن دنوں شاہ نصیر مرحوم سے معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض[1] پارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا۔ لکھنؤ سے آکر مشاعرہ قایم کیا۔ وہ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ اُنہی دنوں دلّی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا۔ اُنہوں نے اُسے مدرسہ کے سلسلہ میں لے لیا۔ اور انشاے اُردو کی ترقی کا جزوِ اعظم قرار دے کر

[1] منشی صاحب مغفور میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر دہلی کالج سابق میں مدرس سیاق ہو گئے تھے۔ میں نے بھی ابتدائی حساب اُن سے سیکھا تھا۔ سنہ ۱۸۵۱ع میں مرے۔

کہتی ہے ہائے بریاں کہ دبیرانِ قضا
داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہوں میں

سمجھو نہ سہل تم خفقاں کو حکیم جی
حضرت اسے بھی جانئے ہمزادۂ جنوں

واؤ

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قائم ہوا اس میں یہی طرح تھی۔ استاد نے یہ دوغزلہ پڑھا تھا۔ جوانی کا عالم تھا۔ اور شاعری بھی جوان تھی قافیہ پیمائی سے دق ہوکر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے۔ جس شعر پر ۴ ہے اس میں شاہ نصیر مرحوم کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ اور بعض اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے۔ کہیں کہیں اُن کی طرف بھی اشارے ہیں۔ ہر ایک کی شرح طولانی ہے۔ اور فائدہ کچھ نہیں۔ قلم انداز کرتا ہوں۔ بر سر معرکہ واقفانِ حال موجود تھے اُنہوں نے مزے لئے:۔

دانۂ خرمن ہے ہمیں۔ قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو
اور جوں خیمۂ لیلیٰ ہے سویدا ہم کو

اُس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو
لکھا ایسا کہ خموشی سے ہے گویا ہم کو

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو
ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو

شوق مستی میں ہے گلگشتِ چمن کا ہم کو
چاہیئے جامے عصا گردنِ مینا ہم کو

ہووے گا کشتیِ طوفاں زدہ تابوت اپنا
آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو

بستگی دل کو ہے کیوں اُس گرہ زلف کے ساتھ
کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معما ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ گرد رم آہو کی طرح — بھاگے ہے دور ہی سے دیکھ کے صحرا ہم کو
کس سے تدبیر درستی ہو ہماری جوں زلف — کہ شکستوں سے بنایا ہے سراپا ہم کو
جا بجا نام تو جوں نقش قدم چھوڑ گیا — خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو
اور ہمدرد کہاں - ہو نہو اے حضرت دل — درد واب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو
پھینک کر شیشۂ دل ہاتھ سے کہتا ہے وہ مست — کیا بنانا تھا ہتھیلی کا پھپولا ہم کو
اثر کفر ہے طاعت سے بھی اپنی پیدا — نقش سجدہ کا ہے پیشانی پہ ٹیکا ہم کو
نخل خرما کی طرح باغ محبت میں ملا — کثرت زخم سے اک خلعت زیبا ہم کو
ایک دم تنگ وہ آئے تھے بغل میں اس پر — غم دوری سے کیا تنگ ہے کیا کیا ہم کو
دم میں اب دم نہ رہا اپنے جو ٹھہری کوئی دم — ہاں مگر ہو ترے آنے کا بھروسا ہم کو
آن پہنچی سر گرداب فنا کشتی عمر — ہر نفس باد مخالف کا ہے جھوکا ہم کو
ہو سکے لاغری و ضعف کہاں مانع شوق — تیری جانب پر پرواز ہیں اعضا ہم کو
ہم گئے جس کی طرف - جوں گل بازی اُس نے — پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو
رشک تھا اپنے نوشتہ پہ کہ اُس نوخط نے — خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو
ہر قدم پاؤں ہیں سر رکھتے ہیں خار رہ دشت — اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو
کرتے جوں کو وہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت — پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو ۴
اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہر دل — طوف گرداب صفت چاہئے اپنا ہم کو
لگ گئی آنکھ جو سودے میں تری زلفوں کی — شب سیاہی نے کئی بار دبایا ہم کو
حرف تلخ اُس لب شیریں سے ہر اک بات پہ آہ — ناصحا سنتے ہیں ہم کچھ تو ہے میٹھا ہم کو
خاک سے کیونکہ ہماری گل رعنا نہ اُگے — کہ کسی گل کی دورنگی نے ہے مارا ہم کو
ایک دم عمر طبیعی ہے یہاں مثل حباب — فکر امروز ہے نے ہے غم فردا ہم کو
جتنے عاشق ہیں بہم - ایک کا ہے ایک عزیز — شمع سے چاہئے ہے خون کا دعوے ہم کو
کیا ستم ہے کہ پئے قطع رہ عشق فلک — آرہ ساں دیتا ہے دنداں عوض پا ہم کو

دل میں تھے قطرۂ خوں چند۔ سو مانند انار
نرہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو

رل گئیں خاک میں جو سوز نہیں ہے اُن کا خیال
کیوں نہ فانوس خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم وہ ہیں وحشی لاغر کہ چھپا لیتی ہے
زیر دامن نگہِ آہوئے صحرا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اُسکی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

آسماں اور وہ انسان بنانا ہم کو
خاک میں تھا مگر اُس ڈھب سے ملانا ہم کو

ذبح کیوں کرتے ہی فتراک سے باندھا ہم کو
چھوڑ۔ ہونے دے تڑپکر ابھی ٹھنڈا ہم کو

دل شکستہ مگر اُس یار نے سمجھا ہم کو
خط بھی جو خط شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

باعثِ رشک ہوا۔ عشق ہمارا ہم کو
تجھ پہ بن دیکھے ہے غش جس نے کہ دیکھا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سبک ایسا ہم کو
لے گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اُس کو ہوئی۔ تھی جو تمنّا ہم کو

ہے وہی جنبش لبہائے جراحت پسِ قتل
کس لب تیغ کے بوسہ کا ہے لپکا ہم کو

ہم وہ ہیں گرم روِ راہ وفا جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ٹپکا مژگاں سے لہو ہو کے جگر آخر کار
ایک مدّت سے اسی ٹپکے کا ڈر تھا ہم کو

خال سرمہ کا نہیں چاہیئے زیبائش کو
اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

یہ تو یوں مضطرب۔ اور سینہ میں لاکھوں روزن
دل کا رہنا نظر آتا نہیں اصلا ہم کو

خطِ توام سے لکھو گور پہ تاریخ وفات
کہ رہی وصل کی تا مرگ تمنّا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاکِ سر کو۔ پر تیری
خواب شب بستر مخمل پہ نہ آیا ہم کو

جسکی آواز سے ہوں رونگٹے سوہاں کے کھڑے
وہ محبّت نے دیا سلسلہ پا ہم کو

اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کے
کہ دیا زہر بھی گر اُس نے تو میٹھا ہم کو

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے۔ کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

ٹپکے ہے جائے عرق ہر بُن مو سے پیکاں
یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو

۴

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

ہم وہ ہیں رند کہ اس عالمِ پیری میں بھی ہے
اُنس میخانہ سے جوں پنبۂ مینا ہم کو

سنگدل نین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنے کا دھڑکا ہم کو

تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشک ہمارا ہم کو

پھرتے ہی آنکھ کے پھیرینگے گلے پر خنجر
ہو چکا آپ کا معلوم ہے ایما ہم کو

گرمیِ تپ سے ہوا سوزِ درون جو افشا
آگیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

حسرت اے خواریِ وحشت کہ گریباں کا تار
ہو گیا ضعف سے تارِ رگِ خارا ہم کو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ ہے زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو

نہ اُٹھیں شورِ قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہے جب تک کہ نہ قم قم لبِ مینا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں ۴
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

وصل کا اُسکے تصور جو بندھا رہتا ہے
تو مزے ہجر میں بھی آتے ہیں کیا کیا ہم کو

واہ قسامِ ازل صدقہ ہم اس قسمت کے
جام عشرت اُسے ۔ اور داغِ تمنا ہم کو

دل میں نشترِ نگہِ یار کا آہی کھٹکا
وہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

کشتہ ہی ہونا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
کچھ کُشندہ سے نہیں خون کا دعوےٰ ہم کو

ق
رہی ہر طرح سے صیدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اُس بتِ بیدرد کے ایذا ہم کو

صید ہی میں نہ فقط ذبح کا کچھ قصد رہا
صلح بھی ٹھیری تو پھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوق بازیگہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں
دیگا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہووے گا
سو بار جڑ سے پھینکدے اسکو اکھیڑ تو

عمرِ رواں کا توسنِ چالاک اس لئے
تجھکو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو

اے زاہد دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانند صبح کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر
دامان و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

جو سوتی بھیڑ اپنے شر و شور سے جگائے
دروازہ گھر کا اُس سگ دُنیا سے بھیڑ تو

چھٹتا ہے کوئی مر کے گرفتار دام زلف
تربت پہ اُس کی جال کا پائیگا پیڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزل فراغ
غافل۔ نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوے محبت کے ہاتھ اُٹھا
اے ذوق یہ اُٹھا نہ سکے گا کھکیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میّت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو
یاں کہاں راحت جراحت پر جراحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شور قیامت جس کو۔ وہ اے چشم یار
تیرے مستوں کی صفیر خواب غفلت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو۔ لیکن محبت ہو تو ہو

انتظار یار میں جو چشم ہو جائے سفید
مردمک اُس میں کہاں ہو داغ حسرت ہو تو ہو

دست ہمّت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمّت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گذری زندگانی عمر بھر
جان شیریں کے دئیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ اُس سے کتابت ہو تو ہو

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن مے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

غزل مرقوم الذیل اور اُس کے بعد کی غزل ابتدائی مشق کی تحریریں ہیں۔ جب ان میں سے پہلی غزل لکھی اور دوستوں کو سُنائی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی آواز گئی۔ سب خوش ہوئے۔ اور تعریفوں نے جوانی کا دل بڑھایا۔ فرماتے تھے کہ ابتدائے عمر۔ طبیعت کی اُمنگ۔ دل باغ باغ تھا کہ آج ہم نے وہ غزل لکھی جو اُبتک

کسی نے نہ لکھی تھی۔ اللہ تیرا شکر کہ تو نے یہ نعمت دی۔ ساتھ ہی دوسری غزل اور بحر میں لکھی۔ زمانہ کے ناموروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آتی تھی۔ دوسری غزل پر ناخوشی پھوٹ بہی۔ اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی۔ یہ جائز نہیں ؛

آغاز عمر۔ ابتدائے مشق۔ کوئی تقویت دینے والا ساتھ نہیں۔ گھبرا گئے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اُن دنوں زندہ تھے۔ اُن سے جاکر حال بیان کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ معترض بے خبر ہیں۔ فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ اور خوش آیندہ بحر کا نکالنا حسن طبع ہے نہ کہ عیب۔ استاد نے کلیات بیدل دیکھا تو بہت غزلیں نئی نئی بحروں میں نکلیں۔ اُنہیں دیکھکر دل قوی ہوا ؛

وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اُس وقت کی باتیں نئی روشنی والوں کو عجیب معلوم ہوتی ہیں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح بند تھی۔ مگر آمد و رفت اُسی آداب و تعظیم کے ساتھ جاری تھی جو کہ اہل سعادت کی عادت ہے۔ اور وہ بھی شفقت بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ بموجب معمول کے ایک دن اُن کی خدمت میں گئے اور سب حالات سُناکر دونو غزلیں سُنائیں۔ اُنہوں نے بھی کہا کہ خوب غزلیں لکھیں بلکہ یہ بھی کہا کہ دوسری غزل بہت خوب ہے اسے مشاعرہ میں پڑھنا ؛

استاد مشاعرہ میں گئے تو تعمیل فرمایش کا خیال کرکے اُس غزل کو بھی لے گئے اور غزل طرح کے بعد شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ اجازت ہو فرمایش کی تعمیل کروں۔ انہوں نے فرمایا۔ ہاں بھئی سُناؤ۔ جگہ تو یہی ہے۔ اب کچھ تو ابتدائی مشق۔ کچھ بحر نئی۔ غرض اتفاق یہ کہ غزل دوم کے مطلع میں مصرع دوم پر پھر کا لفظ نہ تھا۔ جب استاد نے مطلع پڑھا۔ تو شاہ صاحب نے اُس کی تعریف معمول سے کچھ زیادہ کی اور کہا کہ بھئی! اس مطلع کو پھر پڑھنا۔ استاد مرحوم

رُکے کہ یہ بات کیا ہے ؟ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا - اور لفظ بھی دیدیا - یعنے پہلے کہا تھا - ع - زلف بنے وہ دستِ موسےٰ - اب پڑھا ع

پھر زلف بنے وہ دستِ موسےٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

شاہ مرحوم خوش ہو گئے - اور یہ ترمیم ایسی بدائۃً ہوئی کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ نوجوان کی شوخیِ طبع تھی - عمداً پہلے پھر کا لفظ نہ سُنایا تھا - یہاں آپ ہی چوٹ کھائی - آپ ہی اُس کا توڑ کیا ؛

غزل اوّل

تمنّا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مرزِ قلق ہو
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پاؤں پر جاں بحق ہو
جو مے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو - تو سرخی نہ کیو اُس کے رخسار پر ہو
غروب آفتابِ درخشاں اگر ہو - تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو
کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لینے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی - لئے دستِ افسوس کے دو ورق ہو
کرو دو نو آنکھوں کے طبقے یہ روشن - کہ ہو جاؤ رشکِ مہِ چاردہ تم
سُنا ہے کہ تم نور سے اپنے کر تے - منوّر بہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
یہ کشتوں کا اُس مانگ کے اک پتا ہے کہ اُن تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی
اگر سنگِ موسےٰ کا تعویذ رکھدے - تو رکھتے ہی بس درمیاں سے وہ شق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر - مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرایا تو نے تو یہ تھا سمجھ کر - نکل جائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو
اگر رشکِ گلشن نہ ہو مجھ سے باہم - تو گلشن میں ہووے یہ وحشت کا عالم
چٹکنا ہو غنچوں کا آوازِ ضیغم - چمن مجھکو اک وادیِ لق و دق ہو
اگر زخمِ سینہ سے پھاہا اُٹھاؤں - تو خورشیدِ محشر کو میں تپ چڑھاؤں

اگر پنبۂ داغ دل کو دکھاؤں - تو صبح قیامت کا سنہ دم میں فق ہو

یہ بحر و قوافی غزل کی بدلکر - رقم اک غزل کر کرے ذوق جس میں
نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق - جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضموں ادق ہو

غزل دوم

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے - گر اُس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ - جس میں اخگر آتش ہو
اے قاتل حلق بریدہ سے - اک شعلۂ دل گر سرکش ہو
تو روشن حلقہ جیب کا میری - مثل تنورِ آتش ہو
ہو تیرا سیہ رو صبحِ ہجراں - رخصت مجھ سے وہ مہ وش ہو
کیوں! کھینچوں آہ کہ خور بھی پنہاں زیرِ دودِ آتش ہو
لبریز شرابِ ناز دکھا تو ساغر چشمِ کافر کو
تا زاہدِ پاک ملوّث ہو - یا صوفی دلکش میکش ہو
تم وہ وہ زخمِ دل پر میرے کرتے ہو دکھلانے کو
پر بُرّش تیغِ ناز سے اپنے دل میں کرنے عش عش ہو
دل نخل میں قد کے جوں ذکریا چھپکر چشمِ کافر سے
اب ارّۂ جنبشِ ابرو سے کیونکر نہ بزیر کشاکش ہو
لبیک و اذاں - ناقوس و جرس - یا قلقل مے یا نالۂ نے
دل کھینچنے کو اے ہمنفسو! کوئی تو نوائے دلکش ہو
بن تیرے گھر کی آرایش - جب دشمنِ جاں ہو عاشق کی
محراب طاق کماں بن جائے - دستۂ نرگس ترکش ہو
مانند نمکداں چرخ پہ انجم حق نے بنائے اپنے لئے
تا ہر لب زخم حسرت میرا ہجر کی رات نمک چش ہو

گر کلکِ آہ کو گردش دوں تو دودۂ شمع دل سے مرے
طاؤس فلک کا سینہ ابھی۔ جوں سینۂ باز منقش ہو

جب ضعف سے مجھ کو غش آیا تو طنز سے وہ کیا کہتا ہے
بس غش نہ کرو ہم جان گئے تم مرنے پر از حد غش ہو

کیا خون کے دریا جذب کئے ہیں خاکِ کوچۂ قاتل نے
مدفن کو بھی اُس کے سنمکش کے ایسی ہی زمیں دلکش ہو

بس چھوڑو دامن قاتل کا لو ہاتھ بہائے خوں سے اُٹھا
جب اپنا بہا خوں پاؤں پہ اُس کے دل کیوں اُس کا مشوش ہو

کیا رجز کو کر مقطوع و مرفّل تم نے یہ غزل لکھی ہے
ذوق اس کی بحر کو سُن کر شاداں روح خلیل و اخفش ہو

دن کٹا جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو
ہلے صیّاد! تو آیا مرے پر کاٹنے کو

اپنے عاشق کو نہ کھلواؤ کنی ہیرے کی
دانت انجم سے نکالے ہوئے تجھ بن مجھ پہ

وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں
سر و گردن جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر

جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو

اُسکے آنسو ہی کفایت ہیں جگر کاٹنے کو
منہ فلک کھولے ہے اے رشک قمر کاٹنے کو

باغباں نے ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو
چاہے ہے دل یار کا جو رنگ اگر کاٹنے کو

شام ہی سے دل بیتاب کا ہے ذوق یہ حال
ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

چرخ ضدّی ہے کوئی ضد نہ دلاوے اسکو
دیکھیں تم کیسے بُھلکّڑ ہو جسے کرتے ہو یاد

قالبِ خاکیِٔ انساں کو بنا کر کچّا
آبرو خاک میں دی اُس نے ملا آئینہ کی

کہ سُنے عود کو غرقے تو جلاوے اسکو
بھول تو جاؤ بھلا میرے بھلاوے اُسکو

عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکاوے اسکو
مجھ سا ہو آئینہ تو منہ نہ دکھاوے اُسکو

منہ ہے کیا شمع کا ہو بزم میں تجھ سے روکش — چٹکیوں میں ابھی گلگیر اُڑا دے اُسکو
آئے تصویر ہی اُسکی وہ نہ آئے تو نہ آئے — پر مرے پاس کوئی کھینچ ہی لاوے اُسکو
پیار کی بات یہ مجھ سے نہیں اک اور سے ہے — نیری یہ خو ہے کہے مجھ کو سنا دے اُسکو
وہ عیادت کو مری آئے تو کیونکر آئے — مر بھی جاؤں تو ذرا رحم نہ آوے اُسکو

مشت خاک اپنی ہم اُس کوچہ میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوق آپ اُٹھائے نہ اُٹھاوے اُسکو

سگِ دنیا پس از مردن بھی دامنگیر دنیا ہو — کہ اُس کُتّے کی مٹی سے بھی کتا گھانس پیدا ہو
ہجوم آور جو آنکھوں میں ترا شوق تماشا ہو — تو شاخ ہر مژہ سے چشم نرگس وار پیدا ہو
ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنّا ہو — فلک پر حُسن کے ہنستے ہنستے شادیٔ مرگ عیسےٰ ہو
نہ ہووے دسترس دامان وصلِ یار تک ہرگز — اگرچہ سر سے عاشق پاؤں تک دستِ تمنّا ہو
مجھے کیا چاہیئے عقدہ کشا سوز محبت میں — گرہ میری سپند آسا مری فریاد سے وا ہو
درازی میں شب غم کی اگر بہلائے دل مجنوں — خیال زلف لیلیٰ اسکے حق میں الف لیلہ ہو
کرے پرواز مرغ جاں اگرچہ شاخ طوبےٰ تک — پر اُس تار نظر سے مثل مرغ رشتہ برپا ہو
حلاوت یاں کہاں جب ہووے آبِ شور کا دریا — زلالِ خضر کا اک چشمہ سو بھی سب سے اخفا ہو
تصوّر یوں کبھی غفلت میں آجاتا ہے مرنے کا — کہ جیسے عالم رویا میں چشم کور بینا ہو
مجھے بلوہ میں مارا ہے نگاہ و ناز و مژگاں کے — بتاؤں کس کو قاتل کس سے میرے خوں کا دعویٰ ہو
بہ شہرت نام کی بھی وہ بلا ہے ہیچ ہستی کا — کہ صحرائے عدم میں گردنِ عنقا کا پھندا ہو
مرے صحرا میں وہ وحشت برستی ہے کہ مجنوں کے — گرے گر سر پہ قطرہ آبلہ زیر کف پا ہو
کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم اللہ رے وسعت — اگر نہ آسماں ہوں جمع اک خالِ سویدا ہو
اکیلا رہ گیا یاروں سے یوں ہوں ناتوانی میں — کہیں شاخ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتا ہو

جو ذکر اللہ کو ہو ذوق مانع مایۂ عشرت
تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشہ میں صہبا ہو

سرد مہری سے تری گر خونِ دل یخ بستہ ہو — پھر نہ ٹپکے کوزۂ دل گرچہ سب بشکستہ ہو
کیونکہ قابو میں فلک کے عاشقِ وارستہ ہو — یہ تو جب ہو گر کماں کے بس میں تیرِ جستہ ہو
ہر قدم پر ہے خراشِ پائے مجنوں گل فشاں — تاکہ اک اک خارِ صحرائے جنوں گلدستہ ہو
کیا ہوا داغِ محبت سے ہوا دل سر بمہر — یہ نہیں ممکن کہ میرا رازِ دل سربستہ ہو
کیا نکالے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس — جتنی یہ کاوش کرے اُتنی ہی یہ پیوستہ ہو
مُنہ سے جو نکلے مزا جب ہو کہ ہووے دلنشیں — آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعۂ برجستہ ہو

جانے کیا بیدرد اندازِ کلامِ دردمند
ذوق میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو

ایک دن عرفی کے قصیدہ نعتیہ کے اشعار پڑھکر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا:-

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را — ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے استادوں کے قصیدے اس زمین میں ہیں۔ اُس مرحوم نے بھی معرکہ میں لکھا تھا۔ اور عقیدت سے لکھا تھا۔ ہم اپنی زبان میں عرض حال کرینگے چنانچہ اُسی دن شروع کیا۔ اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہ ہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واؤ کے ۱۲ شعر ہیں۔ باب قصائد میں لے جانا کیا ضرور ہے۔ یہیں لکھ دیتا ہوں۔

پتھرا دیا جلوہ نے ترے چشمِ صنم کو — چکرا دیا غمزہ نے ترے طوفِ حرم کو
جب سے کہ لکھا ہے ترا وصفِ رُخِ زیبا — چومے ہے قلم لوح کو اور لوح قلم کو
رونق ہے بہارِ گلِ رخسار سے تیری — گلزارِ حدوث و چمنستانِ قدم کو
جائے نہ کبھی طبعِ جفا پیشہ سے ہرگز — کس طرح نکالے کوئی شمشیر کے خم کو
کیا ڈھونڈتا ہے تو عملِ بغض و محبت — چلتا ہوا تعویذ سمجھ نقشِ درم کو
ہیں اشکِ کباب اشک ترے سوختہ جاں کے — پر کرتے ہیں خوں شبنمِ گلزارِ ارم کو
دیوانہ ترا قید سے ہستی کے جو چھوٹا — چڑھ جائیگا اک زلزلہ صحرائے عدم کو
جس دن سے زمیں پہ ہے فلک خاک سے اُڑتی — دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو

خوبی سے نہیں رونقِ بازار کہ یوسف — اس شکل و شمائل پہ بکا چند درم کو
کیا دیگا دم آکر کسی بے دم کو مسیحا — اللہ سلامت رکھے اس تیغ کے دم کو
دے جام مجھے چشم عنایت سے جو ساقی — دکھلاؤں تماشا ابھی کیخسرو و جم کو
بدہو کوئی یا نیک رقم کام ہے اس کا — احوالِ بد و نیک سے کیا کام قلم کو

منزلِ گم گشتگاں بالکل الگ دُنیا سے ہو — آسماں بھی ہو اگر واں بیضۂ عنقا سے ہو
سایہ افگن جسپہ تو اپنے قدِ رعنا سے ہو — گردباد اس خاک پر ہمسر قدِ طوبیٰ سے ہو
گر کرے معجز نمائی جلوۂ رخسارِ یار — وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو
ہیں وہ مجنونِ بیاباں مرگ ہوں جسکے لئے — جو ہو چادر یا کفن وہ دامنِ صحرا سے ہو
سبحہ صد دانہ بھی پڑجائے گر میرے گلے — دانہ انگور تارِ پنبۂ مینا سے ہو
دشت کو سیراب کردے آبلہ پائی مری — ہر قدم پر چشمہ جاری چشم نقشِ پا سے ہو
ثابت اک ٹانکا نہ چھوڑے دل کا میرے اضطراب — چاکِ سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گر مری دیوے جو چکھا شورابِ اشک
ذوق شور العطش پیدا لبِ دریا سے ہو

صفا میں رخ سے تیرے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو — نگاہِ چشمِ سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو
مری تاثیرِ وحشت وہ ہے مضطر جس سے پتھر ہو — نگیں پر نام لکھ دوں تو نکل کے گھر سے باہر ہو
ترا دیوانہ دل سوختہ آتش قدم گر ہو — جلا دے زیرِ پا گر خارِ مژگاں سمندر ہو
قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستمگر ہو — ابھی قصہ نہ ہو آخر کہ آخر روزِ محشر ہو
جو تو دریا میں دھووے ناخنِ پا گلبدن اپنے — تو ہر اک فلسِ ماہی شکلِ برگِ گل معطر ہو
ڈبو دیں آشنا کو گر سبک دوش اپنی صحبت میں — تو آہن سا نہ کیوں لکڑی کے دریا میں شناور ہو
کھٹکتے ہی رہیں دل میں ترے مژگاں گر گشتہ — ہجومِ نیش کژدم سے اگر دل گنج نشتر ہو
کیا یہ سوختہ جاں تو نے مجھ کو سرد مہری سے — کہ آہ سرد میری شمعِ کافوری سے ہمسر ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو بتخانہ کو چلتے ہیں
مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دَورِ ساغر ہو

نشہ ٹوٹے ترے ساغر کش وحشت کا کیا ممکن
اگر سو ٹکڑے سنگِ کودکاں سے کاسۂ سر ہو

بچائے حق تعالیٰ اُس یزیدی شمر مشرب سے
کہ خوں سید کا جس بیرحم کو خون کبوتر ہو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ میں وابستۂ زنجیر جوہر ہو

مجھے صحنِ چمن بھی عرصہ گاہ حشر ہو تجھ بن
گلِ خورشید میرے واسطے خورشید محشر ہو

جو کھوئے آپ کو وہ منزل مقصود کو پہنچے
تری گم گشتگی اس راہ میں اے ذوق رہبر ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

سمجھ تو کور سوادوں کو ہو جو علم نہ ہو
اگر سمجھ بھی نہ ہو کور بے عصا سمجھو

نہ سمجھو دشت شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

پڑے کتاب کے قصوں میں کیا۔ کرو دل صاف
صفا ہو دل تو یہ از روضۃ الصفا سمجھو

زہے نصیب کہ ہنگام مشق تیر ستم
ہمارے ڈھیر کو تم تودہ خاک کا سمجھو

ہنسے وہ رونے پہ میرے تو پھر صفِ مژگاں
نہ سمجھو چشم پہ دیوار قہقہا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

تمہاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں
اس آرزو میں کہ تم اپنا خاکِ پا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغ قاتل کو
لبِ جراحت دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا مرا خوں اُس نے اپنے کوچہ میں
اسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سُن کے کیا سمجھو

نہیں ہے نام سے کیا کام مثل آئینہ
جو روبرو ہو اُسے صورت آشنا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

یہ چار غزلیں مرقوم الذیل ابتدائی مشق کی ہیں۔ اور انہیں غزلوں میں سے ہیں جنہیں استاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض مرشد زادوں کی فرمایش سے اُن کے مشغلہ موسیقی کے لئے لکھدی تھیں۔ باوجود اس کے اہل نظر ان کے مضامین کو۔ اور قوافی کے پہلو کو دیکھینگے کہ کس رتبہ پر ہیں :-

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
ایک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو

ہے دمِ باز پسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
آئینہ منہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو

ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

پرِ پروانہ پڑے ہیں شجرِ شمع کے گرد
برگ ریزیٔ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

بید مجنوں کو جو ہو جب دیکھتے اے اہلِ نظر
کسی مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو؟

شوقِ دیدار مری نعش پہ آکر بولا
کس کی ہو دیکھتے راہ۔ اور کدھر دیکھتے ہو

لذّتِ ناوکِ غم ذوقؔ سے ہو پوچھتے کیا
لب پڑے چاٹتے ہیں زخمِ جگر دیکھتے ہو

غزل دوم

عبث تم اپنی رُکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

چھپا کے پان یہ کس کے لئے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اُٹھاتے ہو

تم اپنے رخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو؟
کہ میرا اخترِ بختِ سیہ دکھاتے ہو؟

اگر دباؤ کسی کا تمہارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو

ملاپ جائیں جبھی ہم کہ دے کے تم بوسہ
کہو کہ آؤ زباں سے زباں ملاتے ہو

مریضِ عشق کو تم پوچھکر طبیبوں سے
مدام شربتِ عناب کیا پلاتے ہو

ہوں خاک چاٹ کے کتنا ابھی شفا ہو جائے
جو شربتِ لبِ میگوں ذرا چٹاتے ہو

جگر کے آبلے جو پھوڑتے ہو حضرتِ عشق
ہماری چٹکیوں میں ہم کو تم اُڑاتے ہو

گلو! یہ کہہ گئی کیا کان میں تمہارے صبا
کہ لوٹے جاتے ہو۔ پھولے نہیں سماتے ہو

جلن سے رشک کے ہیں ہڈیاں جلی جاتیں — کہ ہائے تم نئے قلیاں کو مُنہ لگاتے ہو

ق ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ — تم آ کے حضرتِ عیسیٰ عبث سُناتے ہو

اُٹھینگے یار کی ٹھوکر سے لے چلو تشریف — نہیں تو پھر کوئی صلوات سُنکے جاتے ہو

جلا رہے ہیں سویدائے دل کو ہم اپنے — نظر گذر کو تم اسپند کیا جلاتے ہو

ہو کرتے سبزہ خط کی جو سیر آئینہ میں — نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر — دکھا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

ق ہمیشہ صدقہ اُس ابرو کے ہوگے حضرتِ دل — یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو

دیا طوافِ حرم میں ہے سامنے محراب — اور اس میں نعرۂ لبیک تم سُنلتے ہو

وہ آئے بام پہ ہیں ہمدمو نہ بیٹھو اب — اُٹھاؤ میرا جنازہ اگر اُٹھاتے ہو

یہ صید بستۂ فتراک کُھل پڑے نہ کہیں — سمندِ ناز کو تیز اتنا کیوں اڑاتے ہو

ق مرے لئے تو ہر اک طرح سے قباحت ہے — یہ تم جو دشمنوں کو دردِ سر بتاتے ہو

لگاؤں گھس کے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے — لگاوٹ اتنی بھلا کس لئے دکھاتے ہو

جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو — کہ دیکے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا کونسا اندازِ گفتگو ہے ذوق — کہ جس پہ زورِ طبیعت تم آزماتے ہو

جو کہوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو — تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

دیکھو! سرِ مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل — پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو

ن۔ ایسا نہ ہو مقتل میں کہیں چھوڑ دے بسمل

حالت طپشِ دل کی مرے پوچھیں اگر وہ — تم اُن کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو

گر دیکھ لے زاہد تو پھر ایمان ہی لائے — تم مصحفِ رخ اُسکو بہ تدبیر دکھا دو

گر چاہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں — جھمکوں کو نہ زلفِ گرہ گیر دکھا دو

اُس چشم کو ہے ناز بڑا تیر نگہ پر — اے حضرتِ دل! آہ کی تاثیر دکھا دو

وہ برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم — اس نالۂ جانسوز کا اک تیر دکھا دو

گر وہ نہیں آسکتے یہاں تک تو بلا سے
دیتے ہیں خبر غیب کی گر شیخ جی صاحب
اک جان ہے اک دل ہے سو ہیں یک رخ و یک رنگ

لاکر کوئی اُن کی مجھے تصویر دکھا دو
کہہ دو کہ ہمیں تم خطِ تقدیر دکھا دو
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
ذوق آج انہیں تم یار کی تحریر دکھا دو

مجھے ابتدا سے سن رسیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہمیں تمہارے استاد کی ایک غزل یاد ہے۔ اُن کے لڑکپن کی ہے۔ وہ بیچارہ بے علم تھا۔ اور طول عمر نے بدحواس کر دیا تھا۔ غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ استاد کو لاکر سنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے۔ کہاں سے ہاتھ آگئی۔ سرسری طور پر درست کر کے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کبھی فرصت میں بنائینگے۔ (بندۂ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کہ کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھے ہیں۔ اور مضمون بھی صاف بچپن کے معلوم ہوتے ہیں ؂

دم ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آب حیات ہو
تو شہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو
جو مذاق شعر کو اے پری میں چکھاؤں تیری شکر لبی
قلم انگلیوں میں جو ہے مری ابھی رشک شاخ نبات ہو
جو ہیں کرتے میرے لئے دعا کہ ہو دام عشق سے دل رہا
تو ہے دل یہ کہتا کہ اے خدا انہیں اس جنوں سے نجات ہو
مجھے کہتے سب ہیں کہ صبر کر جو نہیں تو صبر سے درگذر
سر حسن و عشق پری میں پر۔ نہ وہ بات ہو نہ یہ بات ہو
سرِ راہ کشتۂ ناز کا وہ مزار ہے نظر آرہا

پڑھو آج اسپہ بھی فاتحہ چلو داخل حسنات ہو
ترا حسن وہ بت مہ جبیں کہ ہے صدقہ جسپہ زماں زمیں
جو دکھائے رُخ تو ہو دن وہیں جو چھپائے مُنہ ابھی رات ہو

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہینگے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوق اُسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

کوسوں کیا تنگیِ زمانے کو / کہ نہیں جائے سر اُٹھانے کو
قصد کعبہ کا تھا پھرے اُلٹے / چوم کر اُس کے آستانے کو
تو مکدر نہ ہو تو عشق میں ہم / ایک آندھی ہیں خاک اُڑانے کو

یہاں تک لاغری ہے اس ترے بیمار کے تن کو / عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشم سوزن کو
زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امّارہ / یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کو
کمندِ نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی / لپٹ کر مثل طوقِ فاختہ عنقا کی گردن کو

تصوّر کس طرح بھولے ترا اس چشم گریاں کو / نکالے مینہ برسنے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو
نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیر جاناں کو / نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو
رکھا مہماں بہانہ سے ترے اُس ماہ تاباں کو / بڑے ہی وقت کام آیا مرے رحمت ہے باراں کو

دیکھا دمِ نزع دل آرام کو / عید ہوئی ذوق ولے شام کو

تم مسی مل کر نہ غرفہ سے نکالا منہ کرو / اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو

اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو / کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بُت بیباک ہو
یا مجھی کو موت آجائے کہ قصّہ پاک ہو

غیر نے ایسا پڑھا یا کچھ مرے محبوب کو
لاکھ ہجوّں سے پڑھا اُس نے مرے مکتوب کو

پوشاک آبی آپ کو گر دل پسند ہو
دریا پری حباب کے شیشہ میں بند ہو

خبر کر جنگ نوفل کی۔ تو مجنوں اہل ہاموں کو
کبادہ تا صبا کھچوائے شاخ بید مجنوں کو

جانتے ہیں اب تو کوُئے بت لالہ فام کو
اپنا تو بس سلام ہے دار السلام کو

فرماتے تھے کہ یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

حق نے تجکو اک زباں دی اور دئے ہیں کان دو
اسکے یہ معنے کہے ایک اور سُنے انسان دو

کہے ایک جب سُن لے انسان دو
کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو
یہ ہنستے ہنستے نکلے گل کے آنسو

ایک دن کئی اُستادوں کے مطلع سُنائے اور فرمایا ان کے جواب نہیں۔ لاثانی رہے۔ انھی میں جرأت کا مطلع پڑھا:۔

رُتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اُٹھاتا

ن پوشاک آبی اُن کو اگر دل پسند ہو

لہ ہندوستان کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دو یار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لیکر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ اُس پر پھینکتا ہے۔ وہ اس پر۔ ۱۰۔ ۱۵ دفعہ برابر ردّ و بدل رہتی تھی۔ جس کے ہاتھ سے پھول گر پڑتا۔ وہ ہار جاتا۔ ہارنے کی سزا یہ تھی کہ کہتے تھے اُٹھاؤ آنکھوں سے۔ جرأت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے۔ کاش میرا دل یار کی گلبازی کے کام آتا۔ اگرچہ بہت سی چوٹیں کھانی پڑتیں۔ اور گرتا لیکن اسکے ہاتھوں۔ اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا ؎

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سُن کر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا۔ مگر لڑکپن ہی تھا بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وُہ اَور ہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا :۔

جتنا ہے نمک۔ سب مرے زخموں میں کھپاؤ	پلکوں سے اُٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اللہ مغفرت کرے کیا با انصاف طبیعت۔ اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھ لو ویسا ہی حسن قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دیدیا ہے۔

انہی میں بقا کا بھی مطلع پڑھا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ دیکھو اس کا بھی جواب نہیں ہوا :۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں	اُس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ایک دن نئے اور پُرانے الفاظ کے استعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم ٹُک اکثر بزرگوں سے سُنتے تھے۔ خود بھی کہہ دیتے تھے۔

ٹُک دیکھیو اُس لذت پیکاں کے اثر کو	جنبش مرے اٹنک ہے لب زخم جگر کو

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے لفظوں کو بٹھایا ہے کہ ایک کو جنبش نہیں ہو سکتی ❊

مطلع مرقوم الذیل لڑکپن کا کہا ہوا ہے :۔

دریا میں ترے حسن کے بالے ہیں بھنور دو	اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں مگر دو

ہائے ہوّز

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ	تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
دیں کیونکہ نہ وہ داغِ الم اور زیادہ	قیمت میں بڑھے دل کی درم اور زیادہ
ساتھ اپنے ہے اب فوج الم اور زیادہ	کر تُو بھی بلند آہ علم اور زیادہ
تیز اُس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ	مشتاق شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

۵۱ ایک مسئلہ لوگوں میں عام زبان زد ہے کہ نمک کو پھینکنا۔ یا بے پروائی سے گرانا منع ہے اُستاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ۔ گراؤ گے تو آنکھوں سے اُٹھانا پڑیگا ❊

سر کٹ کے سرفراز ہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

گر شرح جنوں کیجے رقم اور زیادہ
ہو چاک ابھی جیب قلم اور زیادہ

دیتا ہے وہ دم باز جو دم اور زیادہ
شیشہ کی طرح پھولے ہیں ہم اور زیادہ

گھبراتا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش
گھبرانے لگا سینہ میں دم اور زیادہ

کچھ کی رمِ شوق نے تاثیر جو پیدا
اُٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

لذت سے محبت کی ہے ہر زخم جگر کو
ذوقِ نمکِ درد و الم اور زیادہ

کرنے کو سیہ نہ ورق چرخ کو اے دل
نالہ سے نہیں کوئی قلم اور زیادہ

کیا ہوویگا دوچار قدح سے مجھے ساقی
ہیں لونگا ترے سر کی قسم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بار محبت
ہو پشت فلک میں ابھی خم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہو جس کو پس از مرگ بھی یادِ دہنِ تنگ
تنگ اُس کو کرے کنج عدم اور زیادہ

اُس زلف کے مارے کی اگر خاک کو چاٹے
پیدا دمِ افعی میں ہو سم اور زیادہ

اُس شوخ ستمگر کو مری مرگ ہے منظور
ہے زہر نہ کھانا مجھے سم اور زیادہ

ہستیٔ تنک مایہ جو پھونکے گی اسی طرح
ابھرے گا حباب لب یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا اُن پہ بھرم اور زیادہ

کرتی ہے مری خاک جلا کر مجھے پامال
کیونکر نہ اُٹھاوے وہ قدم اور زیادہ

دکھلائے جو وہ صید فگن چشم کی شوخی
ہو آہوئے رم دیدہ کو رم اور زیادہ

آخر مئے عشق آنکھوں سے ٹپکائی کسی نے
بھڑکے ہے جو یوں آتشِ غم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو پیٹ کے ہلکے ہیں نہ پچے بات کب اُن سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

مہمیز سرخار سے نکلا سرِ صحرا
کچھ توسنِ وحشت کا قدم اور زیادہ

صیدِ دل عاشق میں ہے مصروف وہ کافر
بے خوف ہے اب صید حرم اور زیادہ

گر سرمہ کرے خاکِ خرابات کو صوفی
سوجھیں اُسے پھر لوح و قلم اور زیادہ

اے ابروئے خمدار نہ بُرّش میں کمی کر
ہاں تجھکو مرے سر کی قسم اور زیادہ

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رُکے ہے
اُتنا ہی اُسے چاہے ہیں ہم اور زیادہ

جاتا ہے شہیدانِ محبت کا جنازہ
دو تم بھی اُٹھا چند قدم اور زیادہ

یارب یہ مری نبض ہے یا موجِ رمِ برق
کیا ہوگا جو ہوگی تپِ غم اور زیادہ

کہتا ہے مرا شوقِ جراحت کہ صد افسوس
اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ

کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور
مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ

کہتا ہے گلے لگ کے مرے وہ دمِ خنجر
لو عشق کا بھر لو کوئی دم اور زیادہ

ق اس عاشقِ بیچارہ کا ہے آج یہ کیا حال
گریہ سے ہے آنکھوں پہ ورم اور زیادہ

پیٹے سرِ بستر یہ پڑا پاؤں کہاں تک
بس پاؤں نہ پھیلا شبِ غم اور زیادہ

ق ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر اُنھیں کم اور زیادہ

اے ذوق وقتِ نالہ کے رکھ لے جگر پہ ہاتھ
ورنہ جگر کو روئیگا تو دھر کے سر پہ ہاتھ

میں ناتواں ہوں خاک کا پروانہ کی غبار
اُٹھتا ہوں رکھ کے دوشِ نسیمِ سحر پہ ہاتھ

خط دیکھے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے
رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ

کھاتا ہے اس مزہ سے غمِ عشق میرا دل
جیسے گرسنہ مارے ہے حلوائے تر پہ ہاتھ

جوں پنج شاخہ تو نہ جلا انگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

اے شمع دیکھ بزمِ فنا میں سنبھل کے بیٹھ
ماریگی دم میں صبح ترے تاجِ زر پہ ہاتھ

چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے شکیب
تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

قاتل ہے کیا ستم کہ اُٹھاتا نہیں کوئی
آ کر مزارِ کشتۂ تیغِ نظر پہ ہاتھ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اس ناز سے کھڑے تھے وہ رکھے کمر پہ ہاتھ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ
اک زخم تازہ روز ہے زخمِ کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئی نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں
کیا کیا لپٹ کے روتے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں بھر رہا تھا قلانچیں ہرن کے ساتھ

دستِ جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کہ تو
ٹکڑے اُڑا وے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

پایا درِ اثر نہ کہیں شب کو آہ نے
سر مارتی پھری ہے سپہرِ کہن کے ساتھ

بزمِ صنم میں حضرتِ دل ذکرِ کعبہ کیا؟
تھی جب چمن کی بات گئی اُس چمن کے ساتھ

ان ناتوانیوں میں بھی یہاں تک ہے شوقِ دل
گو یا چمن میں اُڑ کے نسیمِ چمن کے ساتھ

دوزخ میں بھی پڑیں تو نہ سیدھے ہوں کج سرشت
آتش میں پیچ و خم ہیں رسن کے رسن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاکِ فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبّت وطن کے ساتھ

لب پر ترے پسینہ کی بوند اے عقیقِ لب
چشمک زنی کرے ہے سُہیلِ یمن کے ساتھ

وحشت تو دیکھو بعدِ فنا بھی مرا غبار
باتیں کرے ہے سقفِ سپہرِ کہن کے ساتھ

دل وہ بلا ہے اژدرِ دوزخ کو کھینچ لے
مارے اگر کمند دمِ شعلہ زن کے ساتھ

چشم و دہانِ حرص سیئے کون غیرِ مرگ
بخیہ کا "تار اُن کے ہے" تارِ کفن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہتِ گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

ہوں زلفِ عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا
لکھدو کفن سیاہیِ مشکِ ختن کے ساتھ

منظور تجھکو کب ہے یہ اے میرے آفتاب
ہو کوئی تیرہ بخت ترا سایہ بن کے ساتھ

داغِ دلِ فسردہ پہ پھاہا نہ ہو نہ ہو
کام اس چراغِ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

جلد آکہ مر نہ جاوے کوئی خانماں خراب | ٹکرا کے اپنا سر دربیت الحزن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دام علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

جنوں کے جیب دری پر ہیں خوب چلتے ہاتھ | سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کر لے چلتے ہاتھ

ملا جو غیر نے عطر اس کو واں تو یاں میری | لکیریں مٹ گئیں ہاتھوں کی ملتے ملتے ہاتھ

نہ آیا گور پہ میری وہ بے وفا ورنہ | گلے لگانے کو تربت سے بھی نکلتے ہاتھ

جو چھیڑے برق کو یہ نفتہ جاں تو کہتی ہے | کہ دیکھو مجکو لگانا نہ جلتے جلتے ہاتھ

اُٹھائے وجد میں جب ہاتھ ہم نے عالم سے | تو پہنچے عرش تلک کودتے اُچھلتے ہاتھ

مریض سوز محبت کی دیکھتا گر نبض | تو پھر طبیب کے بھی آبلوں سے پھلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پاؤں سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ | یا الٰہی کہیں پڑ جاوے نہ دربان کے ہاتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ | ایمان کی کہینگے ایمان ہے تو سب کچھ

لے نگاہ مہر سے دل مت بچشم قہر دیکھ | گر دوئے سے جو مرے تو دے نہ اُس کو زہر دیکھ

کر دُعا میرے لئے شیخ مناجات میں یہ | کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ | اور اس کی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

زیادہ ہوگا توکّل سے بھی کہیں روزہ | کہ اس میں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ

یائے تحتانی

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ۶ والے شعر کو دیکھو۔ وارستگان جمع ہے۔ اور بے اضافہ۔ بے صفتہ باندھ دیا ہے۔ جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ اور آخر میں ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
دل میں آئینہ کے جوہر خار سے

شرح فرطِ حسرتِ دیدار سے
جو نگہ ہے کم نہیں طومار سے

کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغ آتش خوار سے

ہاتھ اُٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل کو تیر یار سے
ہے مشابہ زخم بھی سوفار سے

میرے طرزِ نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمّار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجرِ یار سے
کم نہیں تارِ رگِ گل خار سے

آئنہ اُس شعلۂ رخسار سے
گرم ہے دُکان آتش کار سے

بے نصیب اسکے ہیں گر دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

مارے گر سیلی وہ زلفِ پُر عرق
جھڑ پڑیں دنداں دہانِ مار سے

خنجرِ موجِ تبسّم سے ترے
گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

وائے قسمت تلخکامی ہو نصیب
ہم کو اُسکے لعل شکر بار سے

کرتا ہے دستِ جنوں جب کشمکش
جی اُلجھتا ہے نفس کے تار سے

سُن کے میری جانکنی کو کوہکن
جوں صدا اُلٹا پھرے کوہسار سے

یہ بھی اُس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے

نقطۂ خال اُس کا سودا خیز ہے
پھرتے ہیں اک پاؤں ہم پرکار سے

اُٹھ چکا وہ ناتواں جب رہ گیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

توبہ توبہ کہتا استغفار ہے
وقت توبہ میری استغفار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق میرے وادیٔ پرخار سے

چاہیئے بحرِ محبت میں ہمیں
کشتی اُس کی تیغ لنگر دار سے

اب وہ آئے جب نگہ کو ضعف سے
کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے

تیرے ہی پاؤں پہ اے قاتل گرا
سر مرا اُڑ کر تری تلوار سے

اُس دہن کا نکتۂ موزوں بھی اک
منتخب ہے مخزن اسرار سے

ابر ہے لیکن شفق آلود ہے
زلف اُس کی سرخیِ رخسار سے

خاک عاشق پر اُٹھے جائے غبار
فتنۂ محشر تری رفتار سے

ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں ۴
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

زلف کی قینچی سے دل ڈرتا نہیں
بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے

ق

دل کے آئنہ کو گر کردے گداز
یار اپنی گرمیِ رخسار سے

جوہر اُس سے یوں اُٹھا لیں جس طرح
حرف قرطاس غلط بردار سے

بے تمیزوں کی ہے الفت نقص تام
لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہے خبر آتی نفس کے تار سے

دو برس ہوئے تھے کہ بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تھے۔ اُدھر سے فرمایش زور پر اور ادھر سے طبیعت شور پر۔ کہ شرفائے دہلی میں سے ایک شخص نے مشاعرہ کیا سخن فہم و سخن شناس تھے۔ اہل سخن سے ارتباط رکھتے تھے۔ بڑے اشتہار و اعلام سے شہرت دی۔ استاد کے پاس آئے۔ اور باصرار آنے کا اقرار لیا (میاں صابر بخش کی سرا کے پاس ان کا مکان تھا۔ وہیں مشاعرہ ہوا تھا) استاد مع رفقا کے تشریف لے گئے۔ ہم بچہ تھے ایسے جلسوں میں جانے کے قابل نہ تھے۔

غالب آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے۔ استاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کو کچھ سنائیے۔ استاد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے بادشاہ تھے۔ اور کم سخنی اس سے بڑھی ہوئی۔ ان سے عمر میں بھی بڑے تھے۔ اتنا کہا۔ خوب! بہت خوب!!

غرض مشاعرہ شروع ہوا۔ اور شمع گردش میں آئی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ حکیم آغا جان عیش طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ مگر خوش کلام اور شیریں سخن۔ شوخ طبع شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزل میں قطعہ پڑھا۔ (روئے سخن غالب مرحوم کی طرف تھا):۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے۔ اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبان میر سمجھے۔ اور کلام میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ابھی استاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص[1] پہنچا۔ کہا حضور نے دعا فرمائی ہے۔ یہ غزل دی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ اسے ہمارے پاس آکر بنادو۔ کچھ ہم زبانی بھی کہینگے۔ استاد نے میر مشاعرہ کو پاس بلایا۔ اور حال سنایا۔ انہوں نے کہا۔ آپ کی غزل نہ ہوئی تو مشاعرہ ہو چکا۔ آپ پڑھکر جائیے۔ غرض جو غزل پیش تھی ختم ہوئی۔ میر مشاعرہ نے استاد کی ایما سے خاص خاص اشخاص سے کہہ بھی دیا۔ اور شمع سامنے لاکر رکھ دی۔ کہ آپ غزل پڑھئے۔ استاد نے غزل پڑھی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ یہ ادھر رخصت ہو کر حضور میں گئے۔ ادھر مشاعرہ برہم ہو گیا۔ ہر شخص یہ کہہ کر اٹھ گیا جو سننا تھا سن لیا۔ اب چلو اور سو رہو۔ مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ میاں یہ تو ایک فقرہ تھا۔ وزن شعر کے لئے! بلانا کہاں تھا۔ اور جانا کہاں تھا؟

اتفاق تقدیر دیکھو کہ مشاعرہ کو سالہا سال گذر گئے۔ دلی تباہ ہو گئی۔ اب ۱۸۸۲ء میں مجھے کار سرکار کے لئے راولپنڈی میں جاکر کئی مہینے رہنا ہوا۔ وہاں میر حسین علی نام ایک پیر کہن سال سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دلی کے پرانے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔

[1] بادشاہی ملازم جو بطور خدمتگار کاروبار کرتے تھے۔ خواص کہلاتے تھے۔ دیکھو! جمع کا صیغہ ہے۔ مگر اراکین دربار کی زبانوں۔ اور دفتر کے کاغذوں میں بمعنے واحد مستعمل تھا۔

اور والد مرحوم سے بھی پڑھا ہوا تھا۔ اُنہیں جب وہاں میرا حال معلوم ہوا۔ تو مل کر بہت خوش ہوئے۔ اکثر آتے تھے۔ اور وقتوں کے حال کہانیوں کی طرح سُناتے تھے میں کسی حال میں ہوں کام سے کام تھا۔ اس مشاعرہ کا بھی ذکر آیا۔ انھوں نے ماجرائے مذکور من وعن بیان کیا۔ اور کہا کہ بھئی تمہارے والد مرحوم کے سبب سے ہم بھی ہمراہیوں میں تھے۔ حضور کا طلب فرمانا۔ اور استاد کا جانا واقعی سبب تھا۔ اور اہل حسد نے اُس وقت کہا بھی تھا۔ مگر نہیں! بدگمانی تھی۔ ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم تو اہل راز میں تھے۔ اس وقت مجھے پھر تحقیق ہوا۔ کہ لوگ ان کی سیدھی بات کو بھی اُلٹا سمجھتے تھے۔ اور اُلٹا دکھاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ غزل مذکور یہ ہے :-

ترے کوچہ کو وہ بیمار غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونو کو بلا سمجھے
اسے تیر قضا۔ اس کو پر تیر قضا سمجھے

غلط فہمی ہماری تھی جو اُن کو آشنا سمجھے
ہم اُن کو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے
بہا خوں کوئے قاتل میں اسی کو خوں بہا سمجھے

وہی کچھ تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہراب تیغ یار کو آب بقا سمجھے

ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پہ بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے

بُرائی میں ہماری گر وہ اپنا کچھ بھلا سمجھے
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

تجھے اے سنگدل آرام جان مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

وہ ہم سے خاکساروں کو گر اپنا خاک پا سمجھے
ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے

جو کچھ دل پر گزرتی ہے سنائینگے ہم اس بت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کیا سمجھے

ترے کشتے جو یوں خواب عدم سے یک بیک چونکے
مگر شور قیامت کو تری آواز پا سمجھے

نسیم صبح گلشن میں اگر ہو دے دم عیسے
ترا بیمار غم تجھ بن سموم جانگزا سمجھے

کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے نکہتِ گل کا　　چمن باد صبا سمجھے کہ آوازِ درا سمجھے
نگاہِ لطف اُنکی جب نہ باز آئی تغافل سے　　ہم اُسکی نارسائی اپنا بخت نارسا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا　　حساب دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے
اگر دل کو نکالا چیر کر پیکاں تو رہنے دو　　کہ عاشق اپنے پہلو میں اسی کو دل کی جا سمجھے
کرے آہِ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا　　تو سینہ کو فلک کے آبلہ ساز بر پا سمجھے
حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے　　تمہی سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
ہنسے ہے زخمِ دل تدبیر پر جراح کے کہدو　　انہیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے
ہوا جب گرمیِ الفت سے موم اُس دل شکن کا دل　　تو اسکے دل شکستہ اپنے حق میں مومیا سمجھے
عدو آیا ہے بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا　　کرینگے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے
مجھے آتا ہے رشک اُس رند مے آشام پر ساقی!　　نہ جو دع ماکدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے
نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمر رفتہ کا　　اگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے
خبر سنتے ہی قاصد سے ہوئے ہم بے خبر بالکل　　ترے پیغام کو گویا کہ پیغامِ قضا سمجھے
نحوست بھی سعادت ہوگئی سودے میں زلفوں کے　　گلیم تیرہ بختی سر پہ ہم ظلِ ہما سمجھے
کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا　　خرد کے تیز ناخن ناخنِ انگشت پا سمجھے
بلا اُس زلف کے مصرع میں ہے مضمون پیچیدہ　　اُسی سے یہ کھلے جو معنیِ ناز و ادا سمجھے
ہوا نے زلف کو چھیڑا۔ اور اپنا دم الجھتا ہے　　کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اُسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے　　نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے
بجھاتا گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے　　اور آگ میں یونہی دینا ہے گر عذاب تو دے

ﻟﮧ جب اس شعر پر پہنچے تو غالب مرحوم سے کہا۔ مرزا صاحب! یہ آپ کے مذاق کا شعر ہے۔ وہ بھی خوش ہوئے اور تعریف کی ٭

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس
ذرا دکھا اسے تو چشم نیمخواب تو دے

دل برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے میخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزا شراب تو دے

کہاں بجھی ہے نہ خاک میری آتشِ دل
کہو ہوا سے ہلا دامنِ سحاب تو دے

تمہارے مطلع ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقت انتخاب تو دے

درِ قبول ہے درباں نہ بند کر درِ یار
دعائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

صبا! بگولہ بنے کشتگانِ زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا ٹھہرنے تہِ تیغ اضطراب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں۔ پر آدمی ان کا
تسلّی آ کے مجھے وقت اضطراب تو دے

شکار بستہ فتراک کو ترے مقدور
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سر رکاب تو دے

نشہ میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دلِ شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

جواب نامہ نہیں گر تو رکھ دو نامۂ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ حباب تو دے

بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوز جگر
بجھا پر اُن کی ذرا آتش عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشت خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اک بار آگ دا آب تو دے

کریگا قتل وہ اے ذوق تجھکو سرمہ سے
نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہونگا سرِ منزلِ فنا اے ذوق
مثالِ نقش قدم کرنے پا تراب تو دے

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے،

دل صاف ہو تو چاہئے معنیٰ پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے،

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے،

جز زلف سوجھتا نہیں اے مرغ دل تجھے
دولت کی رکھ نہ مار سرِ گنج سے امید
عنقا نشاں چھپا کے ہے بیٹھا برائے نام

خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے؟
موذی وہ دیگا کیا کہ جو دولت پرست ہے،
گم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے،

یہ ذوق مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے۔ لیک محبت پرست ہے

زخم دل پر میرے کیوں مرہم کا استعمال ہے
قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
عشق کو گر امتحاں پر میرے قصد فال ہے
اب تو جانِ ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
ہم نے جانا تھا کفِ پا میں تمہارے خال ہے
ابر برسوں رو چکا پر سوز غم سے اب تلک
میرے دودِ آہ سے یا تنگ زمانہ ہے سیاہ
میں وہ مجنوں ہوں کہ میرا کاغذ تصویر بھی
جب سے ہے دل میں کسی کی نوک مژگاں کا خیال
جوشِ گریہ کا مرے تم کچھ نہ پوچھو ماجرا
دل پہ ہوں گر داغ سوزانِ عشق ہیں اے گو کہیں
کھاؤں میں بڑا جو اس بن کیونکہ دل ٹکڑے نہ ہو
ہیں جہاں مدفن تمہارے کشتگانِ زلف کے
شوخی قاتل کرے آلودہ کیوں منہ پان سے
فندقوں سے کسی دل خوں تھا کہ میری خاک پر
اس کی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جسکے پاؤں میں
آئے وہ شاید عیادت کو کہ با صد ضعف حال

مشک اگر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے
لوح بالیں پر بھی لکھا سورۂ زلزال ہے
جوشِ داغِ دل ہجومِ نقطۂ رمال ہے
لب تلک بھی اس کو آجانا رہ صد سال ہے
لیکن اب دیکھا سویدائے دل پامال ہے
خاک میرے ڈھیر کی اڑنے میں جیسے ال ہے
آفتابِ آسماں زنگی کے منہ کا خال ہے
شل عیدی باعث خوشنودی اطفال ہے
نشتر زنبور ہے تن پر مرے جو بال ہے
چادرِ آب رواں منہ پر مرے رومال ہے
پھر تو خسرو کا بھی گنج سوختہ کیا مال ہے
جو رگِ پاں ہے وہ مجھ کو شہر کا سا بال ہے
نخل کی جا بید مجنوں ہے وہاں پامال ہے
خون اعجاز مسیحا سے لب اس کا لال ہے
نوک برگ سبزہ جوں منقار طوطی لال ہے
گردش رنگ پری سے حلقہ خلخال ہے
آئی مژگاں پر نظر بھی بہر استقبال ہے

از دو دیوان [illegible]

وادیٔ وحشت میں بھی جا کر نہ دل اپنا کھُلا
پنجۂ مژگانِ آہو شیر کا چنگال ہے

دل میں شکلِ یار کب آئے نظر بے اضطراب
دیکھ لو سیماب بن آئینہ بے تمثال ہے

بسکہ ہے نوروز اپنا آفتاب بادہ سے
دورِ ساغر ہم کو ساقی گردشِ یک سال ہے

پوچھتے کیا ہو شکستِ دل کو صورت دیکھ لو
نامہ ہے چیں بر جبیں قاصد شکستہ حال ہے

بارِ عشق اُس گل کا سر پر رکھ لیا جو ہو سو ہو
اب کسے پروا ہے سو من ہے کہ اک مثقال ہے

غم نہیں صیاد کو ورنہ مری فریاد سے
ہے قفس تو سینہ چاک اور دل مشبک جال ہے

کھل گیا مضمونِ شکستِ دل کا بے خط کے کھُلے
نامہ بر کا اس قدر اپنے شکستہ حال ہے

ہے اسیرانِ محبت کی بلا سینہ میں آگ
شعلۂ جوالہ ساں طوقِ گلو تک لال ہے

ہوتے ہیں اعضائے بوسیدہ تصور سے جدا
کھینچنی تصویرِ مجنوں کی ترے اشکال ہے

روزِ محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہئیں
گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہے

فرماتے تھے کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسۂ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامہ کے لئے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر پنڈارے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسہ میں گئے۔ تمہارے والد وہیں تھے۔ کوٹھے پر جا بیٹھے۔ دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسب حال یہ غزل کہی۔ کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسہ میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انہیں بھی مشاعرہ کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے۔ دوستوں کی فرمائش سے ہم نے یہ غزل بھی پڑھی۔ بیچارے برسوں صحرا نوردی میں تھے۔ اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خط صلح میں آکر اُسے چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھے۔ اکثر اشعار غزل کے اُنکی صورت حال دکھاتے تھے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ اور ۲ والے شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے بات نہ سُنائی دیتی تھی:۔

موے سرِ مارانِ سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
مانگ جو ہے اک مار سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے
آبلہ ہائے سینہ جو خیمہ سے دکھائی دیتے ہیں
مزرع دل پر میرے پڑا کیا غم کا آکر لشکر ہے
ہووے دل مظلوم ہمارا کیوں نہ شہید وشت بلا
درپے اس کے شامیوں کا وہ زلف معنبر لشکر ہے
دیویں موذی زحمت کش کو کیونکہ نہ ایذا جمع ضعیف
دشمن مارِ زخم رسیدہ مور کا اکثر لشکر ہے
کعبہ تو بہ خدا ہی رکھے آج ۔ کہ جوشش ابر نہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوش ہوا پر لشکر ہے
ہیں وہ شاہِ کشورِ غم ہوں یارو جس کے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں اور بہتا سمندر لشکر ہے
۴ گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل ۔ گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے
خالِ چشم جاناں کا مژگاں سے تجمّل دیکھو تو
اُترا پشت پہ ماہی کی کیا لے کے سکندر لشکر ہے

ہووے امامِ برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی
ہوتا گرد اسلامیوں کا جوں سبحہ گوہر لشکر ہے

میری خاکستر اُڑی تھی اُس سے سب گردوں بنے
دل کو رکھدوں اُس دم شمشیر پر گر ڈھب بنے
خال اے خورشید رو رخ پر تمہارے کب بنے
کیونکہ تعلیم نیاز و ناز ہو یکجا بہم

اس میں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے
تا یہ قربانی صراط عشق پر مرکب بنے
تیرہ روز آکر افق پر سوختہ کوکب بنے
گر نہ مجنوں آنکر لیلےٰ کا ہم مکتب بنے

غنچۂ تصویر بھی کھل کر جو عقدے وا نہ ہوں
ہے سیہ کاری سے نامہ یاں تلک اپنا سیاہ
سرمۂ چشم کو اک کیوں بنا اے دود آہ
صحبتِ عیسےٰ بنائیں کیا گدھے کو آدمی
موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ تالا ویں بلا

ہائے قسمت وہ ہمارے عقدہ مطلب بنے
روز محشر پر پڑے گر سایہ اس کا شب بنے
ایسا کاجل بن کہ جس سے اس کا خال لب بنے
جسکے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے
عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب بنے

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جسکے ہاتھ سے
شیخ صنعا سا مسلماں رند بد مشرب بنے

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم چشم سرمہ گیں کو جو اپنے دکھا چلے
دیوانہ آکے اور بھی دل کو بنا چلے
ہم لطف سیر باغ جہاں۔ خاک اڑا چلے
غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقش پا چلے
دکھلا کے مجھکو نرگس بیمار کیا چلے
اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
دل بے غرور حسن زمیں پر نہ رکھے پاؤں
کیا لے چلے گلی سے تری ہم۔ کہ جوں نسیم
افسوس ہے کہ سایہ مرغِ ہوا کی طرح
قائل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہ ہو۔ تو کیوں
ہے گل کا دل تو سنبلِ پیچاں کے دام میں
ہو کر سوار توسنِ عمرِ رواں پہ آہ
لبریز ہو گیا مرا شاید کہ جام عمر
سلجھائیں زلفیں کیا لب دریا پہ آپ نے

تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے
اک دم تو ٹھہرو اور کہ کیا آئے کیا چلے
شوقِ وصال دل میں لئے یار کا چلے
کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے
آوارہ مثل آہوئے صحرا بنا چلے
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے
مانند آفتاب وہ بے نقش پا چلے
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے
ہم جس کے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے
رک رک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے
کیا اڑ کے تجھ سے طائر نکہت بھلا چلے
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے
تم وقت نزع مجھ سے جو ہو کر خفا چلے
ہر موج مثل مار سیہ تم بنا چلے

دنیا میں جب سے آئے۔ رہا عشق گل رخاں / ہم اس جہاں میں مثل صبا خاک اڑا چلے

قاتل سے دخل کیا ہے کہ جانبر ہو اپنا ہوش / گر اڑ کے مثل طائر رنگ حنا چلے

فکر قناعت اُن کو میسّر ہوئی کہاں / دنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے

آلودہ سرمہ سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ / دیکھا جہاں سے صاف ہی اہل صفا چلے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا۔ چھوڑ دے طبیب / یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

لے جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر / پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

اُس روئے آتشیں کے تصوّر میں باد زلف / ہے کیا غضب کہ آگ لگے اور ہوا چلے

اے ذوق ہے غضب نگہ یار الحفیظ / وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیر قضا چلے

استاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کلیاں کرتے تھے۔ بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا۔ دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامّل کیا اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُس دن تو مطلع ہی طلوع ہوا۔ پھر غزل ہوگئی:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے / کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیر حوادث کی کماں افلاک سے / خاک کا تودہ بنا انساں کی مشت خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر / جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے

تیرے صید نیم جاں کی جان نکلے کس طرح / یہ تو وابستہ ہے تیرے دامن فتراک سے

بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کروں / واں کی آتش ہو جو انکے روئے آتشناک سے

آفتاب حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم / اشک خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب / کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا / مے پرستوں کے کفن پر کلک چوب تاک سے

عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسن عارضی / زیب بد اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

الگ تا ہو نہ کھینچ کر مرا ہر تار دامن سے — نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

خبر لوں جیب کی یا میں رہوں ہشیار دامن سے — جنوں اُلجھے ہیں ناخن جیب سے اور خار دامن سے

لگی ہے اس تمنا میں مرے ہر خار دامن سے — کروں دستار میں گر ہو عطا اک تار دامن سے

لگے اس شعلہ خو کے کون مجھ سا زار دامن سے — کہیں اُلجھا ہے اب تک برق کے بھی خار دامن سے

کرے گر دھوتے دھوتے تو جدا ہر تار دامن سے — نہ چھوٹے خون میرا۔ تیرے اے خونخوار دامن سے

کیا تو نے کنارہ ہم سے۔ اور ہاتھوں سے وحشت کے — گریباں ہمکنار آ کر ہوا اے یار دامن سے

تمہارے جلوہ رخ کے جو بسمل خاک پر لوٹیں — تو پریاں آ کے پونچھیں اے پری رخسار دامن سے

ہوا بے پردہ وہ پردہ نشیں۔ تو یوں کیا پردہ — بنایا درمیاں اک پردۂ دیوار دامن سے

وہی زیبا ہے اُسکے واسطے جو قطع ہے اُس پر — نکل سکتا ہے کوئی آستیں کا کار دامن سے

اب انکو شش جہت میں ہفت دریا لوگ کہتے ہیں — گرے تھے اشک کے قطرے مرے دو چار دامن سے

مکدّر ہو وہ گل کیا کیا جو نادانستہ لگ جاوے — ذرا آ کر نسیم دامن گلزار دامن سے

جدا اگر سر ہو تن سے اور جدا ہوں ہاتھ شانوں سے — جدا ہو پر نہ ہاتھ اپنا ترے اے یار دامن سے

ترا مجنون زار اتنا گران جاں ہے نہ اُٹھنے دے — لپٹ جائے اگر صرصر کے مثل خار دامن سے

پھروں کھینچے ہوئے کوسوں میں اپنے زور وحشت میں — ذرا تم باندھ دیکھو دامن کہسار دامن سے

جلینگے آتش رنگ حنائے پا سے گھر کتنے — دکھائینگے ادا جب گرمی رفتار دامن سے

دکھائے صدمۂ زنجیر نے یہ پاؤں مجنوں کے — کہ صدمہ دل پہ ہوتا ہے دم رفتار دامن سے

عزیزا صلا نہیں سرمایہ ہمت کو کہ دریا نے — گرہ دیکر نہ باندھا گوہر شہوار دامن سے

مربّی بھی خلشگر کو نہیں دیتے ہیں آرائش — گلستان پونچھتا ہے کب سنان خار دامن سے

سرایت کوہکن کا خوں اگر کر جائے پتھر میں — نکالے لعل ہی پتھر کی جا کہسار دامن سے

فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جانماز اپنی — اگر دھو ڈالے تو داغِ مئے پندار دامن سے

مرے پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں کیا کیا شکستہ دل — جو کوئی ٹوٹ جاتا ہے اُلجھ کر خار دامن سے

مرا آنسو ہے وہ زہراب۔ نیلا ہو بدن سارا — خدا نا کردہ لگ جائے گر اے غمخوار دامن سے

ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریانی زیبا
کہ جسکو آستیں سے ننگ ہے اور عار دامن سے

یہ تجھ بن اشکباری ہے کہ آنسو پونچھتا ہوں میں
کبھی تو آستیں سے اور کبھی اے یار دامن سے

کہاں وہ موسمِ طفلی کہ جب دامن سواروں میں
تھے ہم تیار کرتے توسنِ رہوار دامن سے

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہو
اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے

میں وہ آلودہ دامن ہوں بنائیں تار سبحہ کا
فرشتے پاک دامن لے کے میرے تارِ دامن سے

یہ صیدِ ناتواں مثلِ پرِ افتادہ اُڑ جائے
لگا لے گر نسیمِ دامنِ کہسار دامن سے

ہوا پنکھے کی خواب آور ہے پر وہ ایک جنبش میں
کریں سو فتنۂ خوابیدہ کو بیدار دامن سے

نگاہ بوالہوس آندھی ہے نہ برسے خاک اُڑانے کو
چھپا لے اے پریرو شعلۂ رخسار دامن سے

نہ ہوگی دل جلوں کی ذوق ہمسایوں سے دلداری
کہ کب فانوس پونچھے شمع کا رخسار دامن سے

ہوں لاغر جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے
ہے کبادہ جو لچک جائے مگس کے بوجھ سے

تھا قدِ رعنا کبھی پر اب ہوس کے بوجھ سے
جھلملاتا سا ہے شعلہ اک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اُس بام پر ٹوٹی کمند
ورنہ میں کیا وہ نہ ٹوٹے مجھ سے دس کے بوجھ سے

شاخِ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جانی پہ آئیں
توڑ دے لوہے کے حلقے کو قفس کے بوجھ سے

مت لگا اے عشق دل کے آبلہ پر نقشِ غم
ٹوٹ جائیگا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

سر جھکاتے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانندِ سرو
ہے سبکساری جنہیں بارِ ہوس کے بوجھ سے

یہ اسیری میں گراں خاطر ہوں میں جاتا ہے ٹوٹ
آہنی قلاب بھی میرے قفس کے بوجھ سے

زندہ تو ڈوبے ہے اور تیرے ہے مردہ آب میں
بوجھ شاید جسم کا کم ہے نفس کے بوجھ سے

باندھ دے ناقہ کی گردن میں دلِ نالانِ قیس
لیلیٰ اس کا بوجھ ہلکا ہے جرس کے بوجھ سے

نکلے دنیا سے کہاں احمق اُٹھا کر بارِ حرص
یہ گدھا تو رہ گیا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

اپنے دامن میں نہ لے میری گلِ لختِ جگر
جی دھڑکتا ہے کہیں چنچلی نہ مسکے بوجھ سے

کیا ہوا دل نے لیا گر ایک کوہِ غم اُٹھا
یہ نہیں اے ذوق دبتا ایسے دس کے بوجھ سے

سر بوقت ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب۔ اللہ اکبر۔ لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے — مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

واہ وا شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک — استخواں میرے ہما کس مزہ سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو — دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کرم سوز دروں پھن جائینگے دل اور جگر — رحم جوش گریہ۔ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے — اُف رے بیتابی۔ کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

زخمی ہوں ترے ناوکِ دزدیدہ نظر سے — جانے کا نہیں جور مرے زخم جگر سے

ہم خوب ہیں واقف ترے انداز کمر سے — یہ تار نکلتا ہے کوئی دل کے گہر سے

گراب کے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

لبریز مئے صاف سے ہو جام بلوریں — زمزم سے ہے مطلب نہ صفا سے نہ حجر سے

سرمایۂ اُمید ہے کیا پاس ہمارے — ایک آہ ہے سینہ میں سو نومید اثر ہے

وہ خُلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں — ہیں شاخ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

حاضر ہیں مرے توسنِ وحشت کے جلو میں — باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

فریاد ستمکش ہے وہ شمشیر کشیدہ — جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں جو ہیں جی کے چلے ہم بہ سوئے دوست — مقصود رہ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اللہ رے وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں — پتھر ہیں پہاڑوں کے اُڑے جاتے شرر سے

کچھ رحمت باری سے نہیں دُور کہ ساقی — رووے جو ذرا مست تو مے ابر سے برسے

کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب — مستی ہے ٹپکتی مری تربت کے شجر سے

کھلتا نہیں دل۔ بند ہی رہتا ہے ہمیشہ — کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

نالوں کے اثر سے مرے پھوڑا سا ہے پکتا — کیوں ریم سدا نکلے نہ آہن کے جگر سے

اے ذوق رہِ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہمدم جو نکل آئے کوئی گرد سفر سے

آیا نہ وہ مہ طلعت۔ کیا دیر لگائی ہے
کھینچ اے کششِ الفت۔ کیا دیر لگائی ہے

قاصد تو کب آتا ہے۔ پر پیک اجل نے بھی
یاں آنے میں یا قسمت۔ کیا دیر لگائی ہے

آنکھوں میں ہے دم تیرے۔ بیمار محبت کا
دکھلا دے کہیں صورت۔ کیا دیر لگائی ہے

آنا بھی کہیں تیرا۔ آنا ہے قیامت کا
اے دلبر خوش قامت۔ کیا دیر لگائی ہے

پروانہ سے کہتی ہے یہ شمع کہیں جل چک
ہے تجھمیں اگر جرأت۔ کیا دیر لگائی ہے

کس فکر میں ہے ساقی۔ دے بادہ جو ہے باقی
تھوڑی ہے یہاں فرصت۔ کیا دیر لگائی ہے

ہے تیغ بکف قاتل۔ تم مرنے پہ جانبازو!
باندھو کمرِ ہمت کیا دیر لگائی ہے

گر قتل ہی کرنا ہے۔ قاتل کہیں کر جلدی
لاحول ولا قوت۔ کیا دیر لگائی ہے

یاں وعدہ بھی آ پہنچا۔ تو اب تلک آتا ہے
اللہ رے تری غفلت۔ کیا دیر لگائی ہے

بے بادہ گلستاں میں۔ پیتے ہیں لہو میکش
ساقی نے دم عشرت۔ کیا دیر لگائی ہے

دے پھونک کہیں دل کو۔ مدت سے سلگتا ہے
اے سوزِ غم فرقت۔ کیا دیر لگائی ہے

بالیں پہ کہا میری۔ ہنگامۂ محشر نے
لو اٹھو کہیں حضرت۔ کیا دیر لگائی ہے

اُسکے لب خنجر کا لینا ہے اگر بوسہ
تو اے دلِ پُرحسرت۔ کیا دیر لگائی ہے

اے ذوق شہید اسکو۔ کرتے ہیں کئی عاشق
کرنے ہو اگر سبقت۔ کیا دیر لگائی ہے

خوب روکا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کیا کہوں کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
غیر تیری حمایتوں سے مجھے

بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے۔ روایتوں سے مجھے

حال مہر[1] و وفا کہوں تو کہیں
نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۸۱ پر

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

کہدو اشکوں سے کیوں ہو کرتے کمی
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

کمئِ گریہ نے جلا دیا دل
ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اُس سرے سب نہایتوں سے مجھے

اِلٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شورِ بِاَیِّ ذَنْبٍ قَتَلْتَنِیْ ہے

غم جُدائی میں تیری ظالم ۔ کہوں میں کیا ۔ مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے ۔ سینہ کاوی ہے ۔ دلخراشی ہے جانکنی ہے

زمیں پہ نور قمر کے گرنے میں صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشنضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا ۔ یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اُسی کے جلوہ کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ۔ ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے ۔ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

لگا نہ اس بتکدہ میں تو دل ۔ یہ ہے طلسمِ شکست غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمایل صنم ہے آخر شکستنی ہے

(حاشیہ صفحہ (١٨٦)) لہ مثنوی مہر و وفا ۔ فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے ۔ پہلے زلیخا ۔ بوستان ۔ سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی ۔ اب اس کا رواج نہیں رہا ۔ یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے ۔ کون سمجھتا ہے اب ان اشاروں کو ۔ خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانند کیمیا گر۔ ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

کوئی ہے کافر۔ کوئی مسلماں۔ جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے۔ وہ اُسکے نزدیک رہزنی ہے

تکلّف منزلِ محبت نہ کر۔ چلا چل تو بے تکلّف
کہ جا بجا خار زارِ وحشت سے بچھ رہا فرشِ سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوق اسکے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوارِ آہنی ہے

آنکھ اُس پر جفا سے لڑتی ہے
جان کشتی قضا سے لڑتی ہے

شعلہ بھڑکے گا کیا بھلا سرِ بزم
شمع تجھ بن ہوا سے لڑتی ہے

قسمت اُس بُت سے جا لڑی اپنی
دیکھو! احمق خدا سے لڑتی ہے

صفِ مژگاں تری خدا کی پناہ
اک بلا۔ اک بلا سے لڑتی ہے

شورِ قلقل یہ کیوں ہے۔ دخترِ رز
کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے

نگہِ ناز اُس کی عاشق سے
چھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے

ترے بیمار کے سرِ بالیں
موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے

آج کہتے ہو کیا طبیعت کو
عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے

زالِ دُنیا نے صلح کی کس دن
یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے

تیری شمشیرِ خوں کی چھینٹوں سے
چھینٹے آبِ بقا سے لڑتی ہے

دیکھو اس چشمِ مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ذوق دُنیا ہے مکر کا میداں
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم۔ اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں یہ بڑا بد معاش ہے

اس بتکدہ میں کون ہے کافر ترے سوا
تو بت پرست بت بھی ہے اور بت تراش ہے

ہوتی وبالِ دوش نہیں عاشقوں کی خاک
اُڑ جاتی ٹھوکروں میں تری اُن کی لاش ہے

بریز صد نشاط ہے شکلِ ہلالِ عید
سینہ میں وہ جو ناخنِ غم کی خراش ہے

کرتے یہ اشک و آہ ہیں تکلیف کیوں عبث
ہو جاتا رازِ دل تو نگاہوں میں فاش ہے

دنبالہ پر جو سرمہ کے دانہ ہے خال کا
دیکھو! وہ دست چشم فسونگر میں ماش ہے

کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق
شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

دُنیا سے بھی اُٹھے تو نہ بستر سے اُٹھ سکے
تیرا مریض عشق جو صاحب فراش ہے

ہے کس مزہ سے عشق میں اپنی ہوئی بسر
افسوس لب پہ ہے۔ نہ کبھی دل میں کاش ہے

بُرّش میں اب تو خنجر خمدار سے بھی تیز
اس شوخ کج ادا نے نکالی تراش ہے

مسکن پذیر آج سے دل میں نہیں ہے غم
روز ازل سے اسکی یہیں بود و باش ہے

اے **ذوق** جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد
دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

ہے تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اک پھانس ہے کلیجے کے اندر لگی ہوئی

چاٹے بغیر خون کوئی رہتی ہے تیری تیغ
بے ڈھب ہے اس کو چاٹ ستمگر لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی

میت کو غسل دیجو نہ اس خاکسار کی
ہے تن کو خاک کوچۂ دلبر لگی ہوئی

عیسےٰ بھی پاس ہے یہیں ممکن مگر شفا
خورشید کو وہ تپ ہے فلک پر لگی ہوئی

میرا گلِ اُمید شگفتہ ہو کس طرح
دل کی گرہ ہے اُس کی گرہ پر لگی ہوئی

گل مہدی کیوں نہ باغ میں ہو پائمال رنگ
پاؤں میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی

کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا
ہے دل سے یاد ساقیِ کوثر لگی ہوئی

اے ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خونابۂ حسرت کے مزے
زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھکو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونیکے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

کھائے کوچہ میں ترے آکے جو سنگِ طفلاں
آئے مجنوں کو ترے میوۂ جنت کے مزے

لگتی مرچیں سی کبابوں کو ہیں سن کر کیا کیا
دلِ بریاں سے مرے سوزِ محبت کے مزے

صرفِ ہر زخمِ جگر تا نہ ہو صد کان نمک
لوٹے کیا عشق میں اس کانِ ملاحت کے مزے

ملتِ عشق میں ہو۔ کاش تناسخ ہی سہی
کہ اڑائیں ترے سر بازِ شہادت کے مزے

دیکھکر اس کو گیا عالمِ حیرت میں تو میں
پر بیاں کیا کروں اُس عالمِ حیرت کے مزے

سجدہ میں پائے خمِ مے پہ ہیں کس لطف سے مست
یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

پھول گلشن میں ہنسے کرکے زر اپنا برباد
کہ اُڑانے ہی میں دولت کے ہیں دولت کے مزے

جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی
پوچھو فرہاد سے اس تلخیِ حسرت کے مزے

ابر و باراں کے مزے کیونکہ نہ لوٹیں میخوار
کہ اُڑاتے ہیں گنہگار ہی رحمت کے مزے

ہے نمک پاش جو منہ ہنس کے وہ لعلِ نمکیں
لے رہا ہے دلِ مجروح جراحت کے مزے

کچھ جتاؤں جو محبت تو ہے کہتا کہ تجھے
دیکھ تو کیسے چکھاتا ہوں محبت کے مزے

ذائقہ چاشنیِ عشق کا کامل ہو تو دیں
شادیِ وصل کی لذت غمِ فرقت کے مزے

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں
پر مزیدار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

خنجرِ ناز نے کیا چاٹ لگائی دل کو
چاٹتا ہونٹ ہے لے لے کے جراحت کے مزے

بے مزاجی کو کریں لاکھ ترے ظلم و ستم
پر نہیں بھولتے وہ پہلی عنایت کے مزے

پھر پھٹا زخم کا انگور مبارک اے ذوق
دلِ زخمی کو ترے بادۂ حسرت کے مزے

کب وہ گذرتے ہیں سرِ لاف و گزاف سے
اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
چل میکدہ میں شیخ بسر کر مہِ صیام
نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو
پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگاں میں وہ پری
ہو جوہر کمال پہ ننگا جو خاکسار
گذری ہے مشقِ سینہ شگافی میں اے قلم
گردش ہے اسکی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد
لڑتے ہیں گر نصیب سے گاہے فلک سے ہم
طوفِ سیاہ خیمہ لیلےٰ ہوا نصیب
جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود

جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے
کھولی نہ آنکھ ابرِ سیہ کے لحاف سے
اس اپنے ناتواں کو پری کوہِ قاف سے
اک تیغ ہے کہ ننگ ہے اسکو غلاف سے
عاشق کی عمرِ نالۂ گردوں شگاف سے
کافر کو کام کعبہ کے ہے کیا طواف سے
فرقت کی رات کم نہیں روزِ مصاف سے
مجنوں ۔ سمجھیو کعبہ کے بہتر طواف سے
ہے دمبدم نکل کے چمکتی غلاف سے
لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اِس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

۱۸۵۰ء میں مرزا خدا بخش شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ کیا ۔ اور دو مصرع طرح گئے ۔

(۱) ع — کیا کیا مصیبتیں ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ

دوسرا ۔ ع

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

استاد نے دونو طرحوں میں غزلیں لکھی تھیں ۔ اور مشاعرہ میں بھی گئے تھے غزل مرقوم الذیل کہہ رہے تھے کہ ایک دوست آئے ۔ اور کہا کہ اس میں تو ساری غزل بے محاورہ ہو گئی ۔ اس طرح میں نہ کہئے ۔ میں نے کہا بے محاورہ ہماری غزل نہ ہو گی ۔ کہوانے والے بے محاورہ ہونگے ایسی طرح کیا سمجھکر رکھی ۔ استاد مرحوم نے تامّل کر کے فرمایا

نہ کہیں ؟ میں نے کہا حضرت ضرور کہنی چاہیئے۔ لوگ ہیں کہینگے کہ انہیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا۔ استاد کا ارادہ پھر مستقل ہوگیا۔ اور غزل تمام کی :-

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندہ ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگ جراحت والے

گئے جنّت میں اگر سوز محبّت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنّت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدّر دونو
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جان بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزار محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرت دیدار مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہیں جُز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کی ہے شکایت۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو دیکے فروغ
خود نمائی کو ہیں چمکا رہے شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے کچھ دل کہتا
دونو اک حال میں ہیں درد و مصیبت والے

بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل
ان کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

تو جو آجائے تو اے درد محبت کی دوا
میرے ہمدرد ہوں بیدرد نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلمِ آتش باز
لکھ کے میری تپش دل کو کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دل بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

تو مرے حال سے غافل ہے برائے غفلت کیش
تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(ن) اُس نے دیکھے ہی کہاں

مرزا نورالدین اور مرزا حیدر شکوہ دو تیموری شاہزادے لکھنؤ میں عمدہ احترام و عزت

کے ساتھ رہتے تھے - مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے - ۱۸۵۱ء میں دلی میں آئے - ہر طرح صاحب لیاقت تھے - اور شعر بھی کہتے تھے آتش کے شاگرد تھے - بادشاہ اُن کی خوبیوں کے سبب سے خوب ہی متوجہ ہوئے اور اپنا سمجھ کر اُن پر اعتبار ظاہر کئے - چاندنی چوک میں نواب رُکن الدولہ کے مکان میں اُترے تھے - تسخیر کے استاد تھے - استاد سے بھی محبت اور تپاک سے اخلاص قایم کیا - بادشاہ کے حکم سے مشاعرہ شروع کیا - استاد سے وعدہ لے لیا کہ بادشاہ کی غزل لے کر اور آپ غزل کہکر مشاعرہ میں لائیں - پہلے جلسہ میں یہی طرح تھی - اور غزل مرقوم الذیل استاد نے پڑھی تھی - بڑی دھوم دھام کا جلسہ تھا :-

کیا غمزہ ترا بر سرِ بیداد غضب ہے — جلاد فلک سے بھی یہ جلاد غضب ہے
ہر ناز میں کرنا ستم ایجاد غضب ہے — سر تا بقدم وہ بت بیداد غضب ہے
ناز آفت و چشم ستم ایجاد غضب ہے — شاگرد بھی ہے قہر جو استاد غضب ہے
اے بلبلِ نالاں تری فریاد غضب ہے — کر بات بھی آہستہ کہ صیاد غضب ہے
گلشن میں ابھی ہنس کے پریشاں ہوئے گل — اس باغ میں آنا بدلِ شاد غضب ہے
نکلے ہے صدا کوہ سے ہم آتش و ہم آب — کیا سوز و گدازِ دلِ فرہاد غضب ہے
خاکسترِ پروانہ پہ روتی ہے بجا شمع — ہو خاکِ جگر سوختہ برباد غضب ہے
دل حسن کے یوسف سے جو ہونے لگا روشن — ہم سمجھے کہ اس چاہ کی افتاد غضب ہے
اُس بت کا سمجھ حسن خداداد نہ اس کو — یہ تجھ پہ خدا کا دل ناشاد غضب ہے
ہوتا ہے سپند ایک ہی آواز میں آخر — کیا سوختہ جانوں کی بھی فریاد غضب ہے
توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دُنیا میں گرانبارئ اولاد غضب ہے
اے شوخ تری چشم غضبناک کے ہوتے — ہم چاہیں قضا سے اگر امداد غضب ہے
اللہ کرے خیر مرے شیشۂ دل کی — پھر آج وہ مستِ مئے بیداد غضب ہے
بھولا نہ مجھے قتلگہِ عام میں قاتل — اللہ رے ترا حافظہ کیا یاد غضب ہے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہے اُنکے عمل سے
کیا حضرتِ آدم کی بھی اولاد غضب ہے

پریوں پہ تری طرح سے مرتے نہیں ہمدم
ہم جیسے ہیں عاشق وہ پریزاد غضب ہے

تارے یہ فلک پر ہیں کہ اُڑتے ہیں شرارے
عاشق کی ترے گرمیٔ فریاد غضب ہے

ہے سرو تو پابندِ غمِ بے ثمری میں
کہتے ہیں گرفتار کو آزاد غضب ہے

غصّہ ہے ترا قہر۔ ترا قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے۔ بیداد غضب ہے

ہے غم سے ہنوز آئینہ با دیدۂ پُر آب
اسکندرِ رومی کی بھی روداد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دُنیا میں نہیں ہے
اور اسپہ بھی دلکش یہ غم آباد غضب ہے

قامت تو ترا سرو کے سر پر تھا قیامت
پر طرّہ سر طرّۂ شمشاد غضب ہے

سو فتنے ہیں پنہاں نظرِ لطف میں اُس کی
یہ لطف نہیں اے دلِ ناشاد غضب ہے

دیں ہوش بھلا مردمِ ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمہاری وہ فسوں یاد غضب ہے

یہ خانۂ ہستی ہے عجب خانہ رنگیں
اے ذوق مگر سستیٔ بنیاد غضب ہے

ہوئے وہ کب قائل قیامت۔ جو تیرا قامت نہ دیکھ لینگے
رہینگے رویت کے بلکہ منکر۔ جو تیری صورت نہ دیکھ لینگے

ہمیں غرض کیا کہ جائینگے ہم۔ حرم کو اے شیخ بتکدہ سے
یہیں بتوں میں خدا کا اپنے۔ ظہور قدرت نہ دیکھ لینگے

نہ دیکھ لی کیسی کیسی آفت۔ جہاں میں ہم نے تمہارے باعث
اور آگے کیا کیا غم و الم ہم۔ تمہاری دولت نہ دیکھ لینگے

دکھا نہ احوال اُن کو اپنا۔ یہ اُن کی اُلفت کا امتحاں ہے
کہ ہوگی الفت تو دیکھ لینگے۔ نہ ہوگی الفت نہ دیکھ لینگے

کہوں یہ کیوں میں کہ حضرتِ دل۔ شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ
کہ آپ ہی تلخیٔ محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لینگے؟

بلا سے گر وا نیاں کا ما۔ نہیں ہے پاس اپنے فال نامہ
ہم اپنے نقطوں سے داغ دل ہی کے فال دولت ش دیکھ لینگے

اگرچہ درد محبت اپنا۔ کہا نہ ہیں نے زباں سے اپنی
وہ میری صورت نہ دیکھ لینگے۔ وہ میری حالت نہ دیکھ لینگے؛

ہلال کو دیکھیں کیوں فلک پر۔ اگر ہے منظور عید ہم کو
تو اُس کے تیغ ستم کا دل میں۔ لب جراحت نہ دیکھ لینگے

بہارِ باراں کو کون دیکھے۔ بغیر یاراں ہے تیر باراں
ہم اس کے بدلے سر شک مژگاں کی اپنے شدت نہ دیکھ لینگے

گذر بھی جاؤں گر اپنے جی سے۔ کہیں گے جیتا ہے جی چُرایا
وہ جب فلک اپنے آستانے پہ میری تربت نہ دیکھ لینگے

مجھے یقیں ہے نہیں دکھائینگے اپنے رخسارِ لالہ گوں کو
رواں مری چشم تر سے جبتک۔ وہ خون حسرت نہ دیکھ لینگے

تپ محبت کا میرے دل کی یقیں نہ آئے گا ہرگز ان کو
طپاں وہ رگ رگ میں میری جبتک کہ برق سرعت نہ دیکھ لینگے

خط اُن کو دے بھی دیا جو قاصد نے ذوق دے کر کسی کا دھوکا
وہ خط نہ پہچان لینگے میرا۔ مری عبارت نہ دیکھ لینگے

کیا بدنظر تم کو ہے یاروں سے تو کہئے
حالِ دلِ بیتاب کہا جائے جو ہم سے
کیا کہئے گا اب اور سرِ خاکِ شہیداں
پھر قم نہ کہیں حضرت عیسےٰ اگر اُن سے
کچھ سوز دل اپنا کسی دلسوز کے آگے
موقوف ہے گر دل کا شکار آن و ادا پر

گر مُنہ سے نہیں کتنے اشاروں سے تو کہئے
گر کہئے نہ لاکھوں سے ہزاروں سے تو کہئے
کچھ فتنے اُٹھانے ہوں مزاروں سے تو کہئے
کہئے۔ کہ یہ قم عشق کے ماروں سے تو کہئے
فرصت ہو تپ غم کے حراروں سے تو کہئے
تو پہلے کچھ اُن میر سشکاروں سے تو کہئے

اُس گوہرِ دنداں پہ اگر سوجھے کوئی بات
موتی تو ہیں کیا مال۔ ستاروں سے تو کہئے

جس راہ سے شانہ ہے گیا زلف رسا میں
اُس رستہ کو ان سینہ فگاروں سے تو کہئے

کہئے نہ تنک ظرف سے اے ذوق کبھی راز
کہکر اُسے سُننا ہو ہزاروں سے تو کہئے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

زالِ دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر
مرد دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے

تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھ کو
تہمت اُس زلف سیہ فام پہ دھر دیتی ہے

رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گذری
کیا طباشیر سفیدیٔ سحر دیتی ہے

ناز و انداز تو ہیں کرچکے سب مشق ستم
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری
عین احساں ہے مجھے زہر بھی گر دیتی ہے

کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی
دل کو فرصت نہیں وہ تیغ نظر دیتی ہے

شمع گھبرا نہ تپ غم سے کہ اک دم میں ابھی
آکے کافور سفیدیٔ سحر دیتی ہے

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا
اب تو اکسیر بھی دیجے تو ضرر دیتی ہے

غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے
چٹخنا مُنہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے

شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

نخل مژگاں سے ہے کیا جانئے کیا چشم ثمر
چشم۔ پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے

کہتے سُنتے نہیں کچھ ہم تو شب ہجر میں پر
نالۂ دل کا جواب آہ جگر دیتی ہے

نہ حسن بھی کم نہیں کچھ عشق سے جانبازی میں - جان پروانہ جو دے شمع بھی سر دیتی ہے

کوئی غماز نہیں میری طرف سے اے ذوق
کان اس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

مزا تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکہ بے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھینگے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

سمجھیو دار و رسن۔ تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

نہ رہتی یوسفِ کنعاں کی خوبیٔ بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھکو روبرو کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزار آرزو کی بہار
تمہاری باد بہاری میں آرزو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمّم آب سے۔ اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمر گذشتہ کا کیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

اُس سنگ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے
وہ اپنی جا نماز ہے اور یہ نماز ہے

ناساز ہم سے جو ہے اُسی سے یہ ساز ہے
کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جسپہ ناز ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

خانہ خرابیاں دلِ بیمارِ غم کی ہائے
ہے وہ دوا خراب کہ جو خانہ ساز ہے

خنجر کہیں نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب
میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
دیکھو حرامزادہ کی رسی دراز ہے

اُس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک
ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

نقطہ پہ خالِ روئے بتاں کے مجھے خدا
بخشے تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

ہر برگ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا
گلشن میں کس کی خاکِ شہیدانِ ناز ہے

اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے نیز رازِ عشق
جو نالہ ہے کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مئے آشام مہینہ بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انہیں دریا میں سفینہ بھر کے

عقدِ پرویں یہ نہیں خفۂ پرویں ہیں ملک
لائے ہیں اُس رُخِ روشن کا پسینہ بھر کے

روز اس گلشنِ رخسار سے لیجاتے ہیں
اپنے دامانِ نظر مردمِ بینا بھر کے

دل ہے آئینہ۔ صفا چاہیئے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں سینہ تو کینہ بھر کے

خمِ پُر جوش کی مانند چھلکتا ہے پڑا
خون حسرت سے یوں تنگ مرا سینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کے ساتھ
ذوقؔ کے ساتھ قدحِ ذوق سے مینا بھر کے

جو تھے مژگانِ پُر خوں سب وہ خارِ دلنشیں نکلے
جنوں پہ کیسے نشتر تھے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

عدوے نیش زن کے گھر سے کب وہ مہ جبیں نکلے؟
الٰہی برجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

چھٹے کیا ہم شوقِ حسنِ گندم گوں۔ کہ گندم پر
ہمارے جدِ امجد چھوڑ کر خلدِ بریں نکلے

ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے

پرے جا کر نئی دنیا سے بھی گر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاک آدم سے نہ چپا بھر زمیں نکلے

خدا دے دور بینی او اس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دوربیں نکلے

رلائے گر تصور اس لبِ شیریں کا آنکھوں کو
تو آنسو ہو کے شربت۔ خوں ہو کر انگبیں نکلے

قلم کی دیکھ گلکاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جائے حرف گلہائے انارِ آتشیں نکلے

زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیرے جانے کا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے

نہ ہو غربت میں گر قدرِ صفا پاکیزہ گوہر کی
تو کیوں دریا سے یکتا ہو کے پھر دُرِّ ثمیں نکلے

تباہی میں ہے موذی کی حلاوت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے

ہوئے تم جیں بر ابرو ہو کے سیرِ قتل کے درپے
چمکنے سے تمہارے جوہرِ شمشیرِ کیں نکلے

سراپا رو سیاہی گر ملے ان نامداروں کو
ہوس دل سے نہ ان کے نام کی مثلِ نگیں نکلے

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
مگر کیا دخل جز زہرِ آب اسمیں انگبیں نکلے

دلِ زخمی کی حالت پر دہانِ زخم کیا بولیں
زبانِ تیغ سے نکلے تو شاید آفریں نکلے

جو حسرت ہے بہ دل میں ہے نکالوں میں کہاں اُس کو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے

سُنا کرتے تھے شہرہ ذوقؔ جنکی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے۔ ہمنشیں نکلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہم تم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
کیا وقت تھا وہ تجھ کو دیا دل تھا جو ہم نے
وہ کونسی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیتے ہیں شبِ وصل میں اُس لب کے یہ بوسے
میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی
رکھتے ہیں دمِ شعلہ فشاں اژدرِ دوزخ
وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے

ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے
تم ہم کو جو پاؤ تو چھری کو نہیں پاتے
اے سنگدل اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے
ہم لب پہ سحر رنگِ مسی کو نہیں پاتے
گم ہو کے مری گم شدگی کو نہیں پاتے
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کی دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اس سرِ خفی کو نہیں پاتے

ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی :-

نبض نملی ہے کہاں میری فلاطوں چلتی — ہے یہ ضعف اب تو کہ چونٹی بھی نہیں یوں چلتی
پہنچے کیونکر جرسِ ناقۂ لیلے کی صدا — آج آندھی نری قسمت سے ہے مجنوں چلتی
کھول دو آنکھوں سے پٹی نہیں دیکھونگا تمہیں — پر چھری اپنی تو گردن پہ میں دیکھوں چلتی
جب میں دُنیا سے چلا سر پہ یہ بولی حسرت — تو اکیلا نہیں میں ساتھ ترے ہوں چلتی
دُور کر بالوں کو سر سے یہ ہے کہتی لیلے — پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں چلتی
میں تو اُن آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں (ق) — کہ نہیں تیری جہاں گردشِ گردوں چلتی
عمر ہے کر رہی ہر دم سفرِ بحرِ فنا — جس کو تو سانس کہے ہے دلِ محزوں چلتی
سمجھے ہے راکب کشتی کہ ہے ساحل چلتا — پر حقیقت میں ہے کشتی سر جیحوں چلتی

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

سنہ ۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علیخاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے

مشاعرہ کیا تھا۔ وہاں یہ غزل پڑھی گئی تھی۔ نواب موصوف۔ نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے۔ (دیکھو صفحہ ۹۸) = اصغر علیخاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ اُنہیں ساتھ لیکر استاد مرحوم کے پاس آئے۔ اور بڑے اصرار و سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایّام! استاد میرے والد مرحوم کے بغیر مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ اُن کے پاس آئے۔ والد نے کہا دل افسردہ ہوگیا۔ میں اُدھر نہیں جاتا۔ تم جاؤ۔ مگر جاؤگے تو سُنو گے کیسے؟ اور سناؤ گے کیسے؟ استاد نے کہا۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ وہ دونو آئے تھے۔ میں نے بھی اُن کے اصرار سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤنگا۔ بندۂ آزاد اُس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جاسکتا تھا جب تک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور مشاعرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اگلے مشاعروں کی باتیں سُن سُن کر آرزومند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا۔ غرض کہ مشاعرہ میں گئے۔ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا۔ کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے۔ مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سُنا۔ میں نے کہا۔ حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا۔ پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سُنا دئے۔ انہیں دنوں میں ہوئے تھے۔

خط بڑھا۔ کاکل بڑھی۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دل	حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا۔ اُنہوں نے بھی کچھ سُنایا؟ فرمایا۔ نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا۔ چرچہ جاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس بیان سے بندۂ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہونگے۔ مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔

ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو۔ اور اُس میں
اثبات مضمون ۲ گواہوں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیہ کے اوصاف سے متصف ہو
وغیرہ وغیرہ۔ اُسے سُن کر جو پڑھتے تو اُسی رتبہ کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر
نہ دھرا تھا۔ اور وہ اُن لوگوں میں نہ تھے۔ کہ شعر سُنا اور شعر خوانی شروع کردی۔
بات کو سمجھتے تھے۔ اور محل و مقام پہچانتے تھے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عزّوشان کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کیلئے
مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زبان کیلئے — یہ ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے
ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جان کیلئے — ستم شریک ہوا کون آسمان کیلئے
فروغ عشق سے ہے روشنی جہان کیلئے — کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کیلئے — قفس میں لوٹ رہا ہے دل آشیاں کیلئے
دم عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے — کمند آہ تو ہے بام آسماں کیلئے
سدا تپش پہ تپش ہے دل تپاں کیلئے — ہمیشہ غم پہ ہے غم جان ناتواں کیلئے
جو سنگ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے شیخ — تو بوسہ ہم نے بھی اس سنگ آستاں کیلئے
نہ دینا ہاتھ سے تم راستی۔ کہ عالم میں — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
دکان حسن میں رکھتے نہیں متاعِ وفا — وگرنہ لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کے لئے
خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن ہے یار — یہ جان اُس ترے مجنون ناتواں کے لئے
الٰہی سوز محبت سے اڑتا ہے تنِ زار — کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے
نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ ہیں تیار — ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
مری مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور — کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کے لئے
الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا[1] — کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے
قدِ خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب وبال — اٹانہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

[1] کانوں پر ہاتھ رکھنا۔ انکار کرنا۔ مکر جانا۔ کان میں کچھ پھونکنا۔ کسی کو اندر ہی اندر بہکا دینا۔

نہ دل رہا نہ جگر دونو جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشم خوں فشاں کیلئے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگار زمانہ رہے نشاں کیلئے

اُمید ہوگئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کیلئے

نگاہ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے
دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کیلئے

تمہاری نرگسِ بیمار نے جو کی تھی نگاہ
وہی جواب ہوا طاقت وتواں کیلئے

مزاج اُن کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاجداں کیلئے

نہیں ہوں نے مگر اتنا مجھے بھی ہے معلوم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کیلئے

اُڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنائینگے ہم
شبِ فراق میں خورشید آسماں کیلئے

چلیں ہیں دیر کو مدّت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کیلئے

وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کیلئے

بیان دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کیلئے

بنایا ذوق جو انساں کو اُس نے جزو ضعیف
تو اُس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

بادشاہی خواجہ سراؤں میں محبوب ایک خوجہ تھا۔ بیگم کی اُس پر بڑی مہربانی تھی۔ وہ بڑھتے بڑھتے میاں محبوب۔ اور میاں صاحب ہو گئے۔ جب بیگم ترقی کرتے کرتے وزارت کی مالک ہوئیں تو محل کے ساتھ مقدمات دربار کے اختیار بھی کل محبوب کو مل گئے۔ اور محبوب علی خاں نواب ہو گئے۔ سفید سیاہ۔ موقوفی بحالی سب ایک خوجہ کی زبان پر تھی۔ بے علم۔ بے لیاقت۔ بیہودہ۔ اُس پر یہ اقتدار۔ ضرور نہیں تھیں کہ علما۔ شرفا۔ امرا کو اُس کے پاس ملتجی کرکے لے جاتی تھیں۔ اُس کمبخت مخنّث کو جُوئے کا مرض تھا۔ شہر کے نامی نامی جواری ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایسے امن کی جگہ انہیں کہاں؟ حضور کبھی کبھی اس سے

ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ناراضی بڑھ گئی۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ بندہ آزاد استاد کی خدمت میں حاضر تھا۔ استاد کے کسی دوست نے کہا کہ میاں صاحب حج کو چلے۔ ایک اور صاحب بولے۔ جاتا ہے نہ آتا ہے باتیں سُنا کیجیئے۔ استاد نے سُن سُن کر فرمایا:-

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کئی مہینے کے بعد غزل پوری کی:-

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کیا خط لکھوں اُنہیں کہ جو لکھنے کی بات ہے
پہلے ہی غیر واں ہیں اُنہیں سب پڑھا چکے

آنا بلا سے اُن کا قیامت سے کم نہیں
ہیں ہم تو مر چکے اُسے آنا ہو آ چکے

زہراب یا شراب یہاں سب ہے نوش جاں
ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے

اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا
جانے دو تم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے

یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ بھی خوب اُنہیں؟
جب رات گو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے

اے دل زمیں بوجھ ہے یا آسماں کا بار
ہیں اب تو سر پہ بار محبت اُٹھا چکے

مدت سے موت و زیست پڑے ہیں گلے کا ہار
تیغ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے

اب ڈھیر گر خرابۂ دُنیا میں ہیں تو کیا
پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اُڑا چکے

باز آیا دیکھنے سے نئے آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے اسے آنکھیں دکھا چکے

حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی
ہیں تیغ آبدار سے خوں میں نہا چکے

سب ہم سے قیمت دل و جاں پوچھتے ہیں آج
نار اُن کے اک نگاہ میں ہیں سب چکا چکے

ہو معرکے میں عشق کے قاضی نہ کیونکہ موت
جھگڑا یہ وہ نہیں ہے کہ جو بے قضا چکے

اپنا ہی دل نہ پھیر سکے رُخ سے یار کے
سر اپنا خوب حضرت ناصح پھرا چکے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی!!
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشاں
دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اُٹھو کہیں - وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ابر کیا - آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا ہے - تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ذکرِ حسن شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
اُن کو در پردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جھوٹ موٹ افیوں کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
اُنکو کف لا کر ڈرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

لطف اُٹھانا ہے اگر منظور اُس کے ناز کا
پہلے اُس کا ناز اُٹھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کہدو قاصد سے کہ جائے کچھ بہانہ سے وہاں
گر نہیں آتا بہانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے

زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے
چاک سینہ کا رسلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

پوچھے مُلّا سے جِسے کرنا ہو سجدہ سہو کا
سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے دئے اُسکو نکال
اپنے ہاتھوں گھر لُٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر اُنہیں بھیجا تو مطلع درد کا
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا مرتا ہوں - وہ بولے مرا کرٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو - یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سُن کے آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کریگا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو سکھایا اپنی قسمت نے - وگرنہ اس کو غیر
کیا سکھائیگا - سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جیوں مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو کچھ کہ ہے دُنیا میں وہ انساں کے لئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لئے ہے

زلفیں تری کافر نہیں دل سے مرے کیا کام / دل کعبہ ہے۔ اور کعبہ مسلماں کے لئے ہے

بیٹھا ہے سخنور جو گرفتارِ تفکر / زیبا یہ قفس مُرغ خوش الحاں کے لئے ہے

مستوں کے لئے رحمتِ باری کے ہیں آثار / زاہد جو دُعا مانگتا باراں کے لئے ہے

اپنوں سے نہ مِل۔ اپنے ہیں سب ہونگے دشمن / ہر نَے میں بھری آگ نیستاں کے لئے ہے

میں کس کی نگاہوں کا ہوں وحشی کہ مری خاک / اک کحل بصر چشمِ غزالاں کے لئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی / باقی ہے تو میری شبِ ہجراں کے لئے ہے

عاشق کا جنوں طرفہ تماشا ہے کہ ہر بات / گویا سبق اطفالِ دبستاں کے لئے ہے

وُہ زلفِ سیہ پھینکتی کیوں دام ہے دل پر / یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کے لئے ہے

دل بھی ہے مرا جان ترے مشقِ ستم کی / جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لئے ہے

دل قیدِ تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لئے ہے

ناسخ لکھنوی

چُنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے / ستاروں میں کیا کیا چنانِ و چنیں ہے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے / خبر بھی نہیں یاں کہ ہے یا نہیں ہے

یہی گر تری چشمِ سحر آفریں ہے / تو دل ہے۔ نہ جاں ہے۔ نہ ایماں دیں ہے

صنم میرے دل کو خدائی کا تیری / یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہر اک چاند دیکھے ہے اُنتیسویں کا / جہاں ناتواں بین و باریک بیں ہے

رُکے اشک اور آہ پہنچی فلک پر / مرا عشق کم خرچ و بالانشیں ہے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو / یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے

پڑے تفرقے یہ جُدائی سے تیری / کہ میں ہوں کہیں۔ دل کہیں۔ جاں کہیں ہے

شبِ غم میں دمساز و دلسوز اپنا / دمِ سرد ہے نالۂ آتشیں ہے

ہنسی ہے جو کچھ رنجش آمیز اُن کی / تو موجِ تبسم بھی چینِ بر جبیں ہے

نہ ہووے اگر تجھ کو دم کا بھروسا / تو جو دم ہے غافل دمِ واپسیں ہے

وہ پہلو میں بیٹھے ہیں اور بدگمانی	لئے پھرتی مجھکو کہیں کا کہیں ہے
ہنسی آتی ہے مجھکو جب تیرے آگے	کوئی ماہ کنعاں کو کہتا حسیں ہے
جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو	لگائے ہوئے میرا دل دور بیں ہے
نہیں وہ رہے ہم سے۔ تم تھے جو پہلے	زمانہ کو تو کچھ تغیّر نہیں ہے
وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے	وہی آسماں اور وہ ہی زمیں ہے

نہ کی آہ سوز غم دل پر اُٹھائے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

مرقوم الذیل مشاعرہ کی طرحی غزل ہے۔ مرزا خدا بخش شاہزادہ کے ہاں پڑھی تھی۔ حکیم آغا جان عیش استاد کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اپنی غزل میں پڑھا:-

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے	تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

شعر ۴ کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد مرحوم استاد کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ اُن سے استاد نے کہا کہ مضمون لڑگیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ اُنھوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہئے۔ طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک نقطہ پر دو فکر پہنچے۔ اور کس کس انداز سے پہنچے۔ حکیم صاحب کے بعد ہی انکے آگے شمع آئی۔ حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے کیا نیک نیّت اور منصف مزاج تھے۔ شعر مذکور سن کر خوش ہوئے۔ رسائی طبع کی تعریف کی اور کہا کہ آپ فی الواقع اُستاد ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۱۷۴) *

چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے	پر کچھ نشانی اپنی مجھے یادگار دے
تو چشم میں نہ سرمۂ دنبالہ دار دے	مفتونِ چشم کو یوں ہی اک تیر مار دے
ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کب وہ نگار دے	جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے پشت خار دے
ٹانکے نہ زخمِ دل میں ترا دلفگار دے	تو جب تلک نہ گیسوئے مشکیں کا تار دے
دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے	یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اُتار دے

گلشن کو آب گر مژۂ اشکبار دے
کیا خاک تجھ پہ جاں کوئی جاں نثار دے
وہ زلف مشکبار اگر ایک تار دے
جولاں سمندِ ناز کو اے شہسوار دے
وہ ناتواں ہوں میں کہ نہ جنبش کروں کبھی
عشق اُس پری کا ہے وہ بلا جانے لیکے جاں
ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط
غم یار کا رہیگا مرے ساتھ تا بہ حشر
کرتا ہے یوں فغاں دلِ امیدوارِ وصل
بن جوں وہ گل کہ پہنچوں نہ گلبن سے خاک تک
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
میں ہوں وہ زندہ دل کہ مری جانِ بیقرار
لے دام داغِ دل سے مرے سوزشِ آفتاب
نے رحم ہے۔ نہ پاس مروّت۔ نہ منصفی
ہو گرمیٔ وفا سے شگفتہ نہ گل کا دل
بے فیض چشمہ آبِ مُصفّا کا ہے تو کیا
جانبازِ عشق جان تلک اپنی کھیل جائے
جوں شمع مُردہ کشتۂ زلفِ سیاہ کو
چھوڑے کمان چرخ نہ تیر اپنا چھوڑنا
عاشق نہ بدلے انجم گردوں سے اپنے اشک
پشّہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
اس جبر پہ تو ذوقِ بشر کا یہ حال ہے

بُلبل بجائے بیضہ دُرِ آبدار دے
مٹی بھی جس کو تیرے نہ دل کا غبار دے
پھر میں نہ لوں اگر کوئی مشک تتار دے
تو سرمہ چشمِ ماہ میں میرا غبار دے
پلٹے اگر نہ مجھکو دلِ بیقرار دے
یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اُتار دے
قاصد جواب زندگیٔ مستعار دے
سچ ہے کہ ساتھ یار کا کیونکر نہ یار دے
جیسے اذاں بلند کوئی روزہ دار دے
جنبش اگر نہ مجھکو نسیم بہار دے
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے ۴
برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے
وعدہ پہ روزِ حشر کے پر کون اُدھار دے
پھر جان کس اُمید پہ یہ جاں نثار دے
جاں اپنی اُس پہ بلبل شیدا ہزار دے
مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے
لیکن قمارِ عشق میں ہمّت نہ ہار دے
گر دے کفن تو دامنِ شبہائے تار دے
یہ آہ تیر ناک ہیں اس کی ہزار دے
کیوں کوڑیوں کے مول دُرِ شاہوار دے
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پُرانی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی :-

پُوچھ مت راہِ وفا اُس نگہِ پُرفن سے
رہنمائی کی نہ رکھ چشمِ دلا رہزن سے

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے
بچ کے جانا کہ یہ اُلجھینگے ترے دامن سے

کافرِ عشق ہوں گر سر بھی جُدا ہو تن سے
نکلے زُنّارِ محبّت نہ مری گردن سے

تار ہر ساز کے پردہ میں محبّت کے سبب
ایک فریاد نکلتی ہے دلِ آہن سے

ہوں ہیں وہ سوختہ جوں شمع کہ مثلِ فانوس
میرا پیراہنِ تن میرے جدا ہے تن سے

تیغِ غم سے ہو نہ کیوں سینہ سپر مردِ وفا
کثرتِ زخم بدن پر نہیں کم جوشن سے

تیرہ بختوں کا ہے وہ کلبۂ تاریک بلا
ڈر کے خورشید بھی جھانکا نہ جہاں روزن سے

ہیں گرانبارِ محبت مرا خوں بھی ہے گراں
جی دھڑکتا ہے ترے نازکی گردن سے

خوں مرا داغ نہیں۔ دھوتا ہے تو کیا قاتل
یہ نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹیگا ترے دامن سے

ہوگیا کاغذِ سوزن زدہ سینہ سارا
دل کی جو پھانس تھی نکلی نہ سرِ سوزن سے

گر جھکے تیغ تری سر ابھی حاضر ہے کہ ہم
اس پہ مرتے ہیں کہ تعظیم تو لی دشمن سے

چشمِ میگوں و صراحی بہ بغل۔ جام بکف
دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے

چھوڑ کر گھر ترے ہاتھوں سے نکل جائیں کہاں
تنگ ہمسایوں کو اے ذوقؔ نہ کر شیون سے

فلک تو ٹیڑھا ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے تیری اپنا کام چلتا ہے

بھرے جاؤنگا میں صیاد دمِ گلشن کے چلنے کا
مرے سینہ میں جبتک دم بزیرِ دام چلتا ہے

ہمیشہ دورِ عشرت ہے جو تم ہو اہلِ کیفیت
کہ مہر و ماہ سے دن رات یاں اک جام چلتا ہے

چلا پہلو سے اُٹھ کر جبکہ وہ آرامِ جان و دل
کہا آرام نے ہم سے کہ لو آرام چلتا ہے

ترا تیرِ نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہے بن کر موت کا پیغام ہے

سمندِ وحشت[لہ] اپنا شاخِ گل کے تازیانہ سے
جنوں کی شاہراہوں میں سداشہ گام چلتا ہے

لہ پہلے فرمایا تھا۔ سمندِ وحشت اپنا چوبِ گل کے تازیانہ سے۔ پھر فرمایا ہر شخص نہ سمجھیگا۔ عام لوگوں کو کیا خبر ہے کہ ایران میں جسے موسمِ بہار میں جنون ہو جاتا ہے اُس پر یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے۔ اور اسے چوبِ گل زدن کہتے ہیں ۔

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دُنیا میں — یہ تیرا خوب جادُو اے خیالِ خام چلتا ہے

عجب شطرنج گردوں ہے کہ جس میں اپنے گھوڑے کو — نئے منصوبہ سے روزِ ابلق ایّام چلتا ہے

کہو صیاد سے گر ذبح کرنا ہے تو جلدی کر — ابھی کچھ دم مرے سینہ میں زیرِ دام چلتا ہے

ارادہ گر کرے ناقص علوئے جاہِ کامل کا — تو یہ جانو کہ نابینا کنارِ بام چلتا ہے

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا **ذوق** اگر پایا — کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

۴

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے — آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تابِ رُخِ سیم تن میں ہے — پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم — یہ وُہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھیے کس کس کے نام سے[۴] — اِس درد سے عقیق کا دِل خوں یمن میں ہے

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب — زیرِ شکنجہ زُلفِ شکن در شکن میں ہے[۴]

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزا — بھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

ہیں روزنِ دہن میں جو کژدم لیے ہوئے — یہاں کام اُن کا نیش زنی ہر سخن میں ہے

دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق — دیکھیں سہیل کیونکہ چمکتا یمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا دردِ سر میں **ذوق** — آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

غزل مذکورہ ذیل ابتدائی مشق ہے۔ اسوقت استاد کی ۱۶-۱۷ برس کی عمر تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک دن والد مرحوم کو اُستاد نے کچھ پُرانے مسودے دیئے میں اُن دنوں لڑکا تھا۔ وہ دیکھتے جاتے تھے۔ اور ہر کاغذ پر حسبِ حال کچھ کچھ کہتے بھی جاتے تھے۔ جس پرچہ پر غزل مرقومہ ذیل کے شعر لکھے تھے۔ اُسے دیکھ کر والد نے افسوس کیا۔ اور کہا۔ اوہو۔ دیکھو جی! یہ وہ غزل ہے۔ بھئی کیا دن تھے وہ۔ اس مرحوم کا بھی افسوس ہی ہے۔ اُستاد نے کہا۔ افسوس!

۴ رنگیں ہے آج گل کے گل نو بہار سے — اگلا جو برگِ زرد کوئی اِس چمن میں ہے

پھر ایک دن میں نے والد سے پوچھا - تو معلوم ہوا - کہ شاہ نصیر مرحوم کے بیٹے وجیہ الدین منیر تھے - اُن کی بھی اُس زمانہ میں ۱۶ - ۱۷ برس کی عُمر تھی - اور طبیعت بھی تیز تھی - اُستاد کے ساتھ اکثر شعروں اور غزلوں کے معرکے رہتے تھے - ایک دن اُنہوں نے اُستاد سے کہا مصرع طرح کرتے ہیں - آؤ غزل لکھو - لڑکپن کا عالم تھا - اُستاد نے کہا - کہو - کہئیے - مگر غزل کہی - اُستاد سے (شاہ صاحب) کہوالی - پھر کہا کیا ؟ منیر نے کہا - اچھا پھر تم بتاؤ - اُستاد نے کہا - ہم تم یہیں بیٹھ کر کہیں - دونو بیٹھ گئے - اور طبع آزمائی ہونے لگی - اُستاد نے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں غزل کہی - اور کہا - کیوں صاحب ! اُنہوں نے بھی غزل کہی تھی دونو غزلیں پڑھی گئیں - اُستاد نے اپنی غزل اُنہیں دی - اور چلے آئے - دوسرے دن اُستاد گئے - تو اُنہوں نے کچھ اور شعر بھی سُنائے - بعض میں ترمیم تھی بعض اشعار پر اُستاد نے کہا - یہ شعر تمہارے ہیں ؟ اُنہوں نے کہا - بیشک - اُستاد نے کہا - اب یہ شعر اُستاد (شاہ صاحب) کے ہیں - صاف معلوم ہوتا ہے - اِنہوں نے کہا - واہ ہمارے ہیں - اس پر خوب گفتگوئیں رہیں - طرفین کے یاروں میں صلاح مشورے - اور مقابلے ہوتے رہے - خُدا کی شان ہے - شاہ وجیہ الدین نوجوان دُنیا سے گئے - اُستاد بُڈھے ہوئے تو کیا - آخر چلے ہی گئے - افسوس - وقت گذرتا ہے - باتیں یاد رہ جاتی ہیں - الٰہی ہم سے نیکی اور راستی یادگار باقی رکھیو - غزل مذکور میں سے جو کچھ باقی ہے وہی لکھ دیتا ہوں -

یہاں کے آنیکا مقرر قاصدا وہ دن کرے	جو تو مانگیگا وہی دونگا خدا وہ دن کرے
کون سی شب آئیگا وہ مہ منجم سے کہو	تیرے سعد و نحس کا معلوم تا وہ دن کرے
تو کرے قرباں ہمیں جسدن ہمارے واسطے	عید قرباں سے شرف پیدا سو وہ دن کرے
جب کہا قاصد نے دن وعدہ کا آیا تو کہا	اس سے کہدو یوں ہی محشر تک گنا وہ دن کرے

تیغِ قاتل سے رہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشور کا وہ دن کہے

دن قیامت کا تو ہے بر میر اطومارِ عمل
ہائے اتنا ہے کہ امکاں کیا وفا وہ دن کہے

نیک و بد سب دن خدا کے ہیں لکھی جس دن کی ہو
کچھ کرو لیکن فراموش کیا قضا وہ دن کہے

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچ میں
یعنی مری فاتحہ کا کون سا وہ دن کہے

ذوق کہتا تھا کرونگا جمعہ کو حُب کا عمل
کوئی اسکو جا کے بتلاوے ہوا وہ دن کہے

یہ غزل بھی اسی عہد کی ہے ۔مسودات مذکور سے نقل کی ہے ۔

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری حقیقتِ پُردرد کو کوئی اُس سے
بہ آہ و نالہ نہ کہوے بہ چشمِ تر تو کہے

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتش عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کے شرر تو کہے

بقدر مایہ نہیں گر ہر ایک کا رتبہ و نام
بھلا حُباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے

جو چپ لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

جل اُٹھے شمع کے مانند قصہ خواں کی زباں
ہمارا قصہ پر سوز لحظہ بھر تو کہے

شہید عشق کا ہر قطرہ خون انا الحق ہے
کہے جو حق کوئی منصور اسقدر تو کہے

مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے
کہیگا اور تو کیا ۔ پہلے الحذر تو کہے

بھرے گا بار محبت کی کیا فلک حامی
یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے

بلا سے ہووے مرا مرغ نامہ بر بھونرا[1]
کہ اُس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوشخبر تو کہے[1]

سرشک چشم مرے ہیں کہ ہو گئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائینگے

سامنے چشمِ گہر بار کے کہدو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اُتر جائینگے

[1] دلی میں رسم تھی ۔ کہ جب بھونرا اُڑتا ہوا پاس آتا تھا ۔ تو اسے شگون نیک سمجھتے تھے ۔ اور کہتے تھے خوشخبر خوشخبر ۔ خاندان تباہ ہو گئے ۔ وہ لوگ اب نہ رہے ۔ کون کہے ۔ اور کون سُنے ۔

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائینگے

خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہم داں
پر مرے زخم نہیں ایسے کہ بھر جائینگے

لائے جو مست ہیں تربت پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائینگے

پہنچینگے رہِ گذرِ یار تلک کیونکر ہم
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائینگے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم سے تر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوےٰ تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائینگے

رُخِ روشن سے نقاب اپنے الٹ دیکھو تم
مہر و مہ نظروں سے یاروں کی اُتر جائینگے

شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں
پر یہی ڈر ہے۔ کہ وہ دیکھ کے ڈر جائینگے

ہم بھی دیکھینگے کوئی اہلِ نظر ہے کہ نہیں
یہاں سے جب ہم روشِ تیرِ نظر جائینگے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملّا
اُن کو میخانہ میں لے آؤ سنور جائیں گے

دل بچے کیونکر بتوں کی چشمِ شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سینکڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی آ کہ تو واقف نہیں
اِس دلِ بیتاب و جانِ مضطرب کے ڈھنگ سے

بل بے باریکی کہ گویا ہر تیرا تارِ سخن
جنتری میں کھچ کے نکلے ہے دہانِ تنگ کے

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغِ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھیگا کہاں تو ہم سے اے رنگینِ ادا
ہوگا تو جس رنگ میں لیجائینگے اُس رنگ سے

جوشِ گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اسکی تیغِ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نمازِ عشق میں
دل سے کہہ دیجئے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہو گئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریشِ سفیدِ شیخ پر
وسمہ آبِ بنگ سے ۔ مہندی مئے گلرنگ سے

کوئی اِن تنگ دہانوں سے محبت نکرے
اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نکرے

ہے جراحت کا مری سودۂ الماس علاج
فائدہ اس کو کبھی سنگِ جراحت نہ کرے

عشق کے داغ کو دل مُہرِ نبوّت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوئے نبوّت نہ کرے

ہر قدم پہ مرے اشکوں سے رواں ہیں دریا
کیا کرے جادۂ اگر ترکِ رفاقت نہ کرے

آج تک خون سے مرے تر ہے زبانِ خنجر
پھر کرے کیا جو طلبِ کوئی شہادت نہ کرے

مکتبِ صبحِ ازل کا ہے خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ ہی خلافت نہ کرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

پھر چلا مقتلِ عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نہ کرے

کہتے ہیں جھوٹ سب کہ نہیں پانو جھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

چلتا ہو ذوق قید سے ہستی کے چھوٹ کے
یہ قید مار ڈالے گی دم گھونٹ گھونٹ کے

ڈھالا جو تجھ کو حسن کے سانچے میں اے صنم
آنکھوں کی جائے بھر دیئے موتی سے کوٹ کے

بیدرد۔ سینہ کو تنا خالی نہیں مرا
دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق
روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

ہر دم دلِ خون گشتہ میں ایک جوش فزوں ہے
جو آہ ہے سینہ میں سو فوارۂ خوں ہے

دنیا کی ہے رفعت کا سبب پستیٔ ہمت
گردوں کو ہے اوج اِسی سے زمانہ میں کہ دوں ہے

پھر جاتی ہے سینہ کو مری آہ بھی اُلٹی
قسمت ہے جو برگشتہ ہوئی بختِ نگوں ہے

ہیں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز
پر دل یہی کہتا ہے کہ ہر گز نہ کہوں ہے

ایک غمزہ تری چشمِ فسوں کار کا کافر
سو چشمِ پری کو سبق آموزِ فسوں ہے

دل کرتا ہے اس کوچہ کا جب قصد تو لیتا
طائر کے عوض رنگِ پریدہ سے شگوں ہے

قائم ہے بنا درد کی فریاد سے میری
جو نالہ ہے ایوانِ محبت کا ستوں ہے

جس مُنہ سے ہوا عشق مرے درپئے تعلیم
ہر خارِ بیاباں قلمِ مشقِ جنوں ہے

مر جاؤں مگر رازِ محبت نہ جتاؤں
کیسا ہی اگر درد ہو دل میں نہ کہوں ہے

بیتابیٔ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف
دکھلا رہا گاہے حرکت گاہ سکوں ہے

بیتابیٔ دل کا کوئی مضموں جو ہوا نظم
ہر حرف پہ میرے حرکتِ جائے سکوں ہے

تلخابۂ حسرت کو پیوں کیوں نہ ہنسے سے
میری یہی تبریدِ تپِ سوزِ دروں ہے

ہے وصل میں غم ہجر کا اور ہجر بلا ہے
آرامِ محبت میں ہمیں یوں ہی نہ یوں ہے

آلودۂ اظہار نہ ہو رازِ محبت
دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں نہ کہوں ہے

کھو آپ کو گر ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل
گم گشتگی اِس رہ میں تری رہ نموں ہے

ہاروت سے وہاں لاکھوں ہیں شاگرد کہ جس جا
وہ چشمِ فسوں گر سبق آموزِ فسوں ہے

کیوں حالِ زبوں اپنا بیاں کرتا ہے اُن سے
اے ذوق تیرے واسطے یہ سخت زبوں ہے

کرے ہے کام تیغِ یار کس کس آبداری سے
دکھاتی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخم کاری سے

زباں کھولینگے مجھ پر بدزباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی اُنکے مُنہ میں خاکساری سے

گذرتی ہے مزہ میں زندگی غفلت شعاری سے
مِرے نزدیک بیہوشی ہے بہتر ہوشیاری سے

نہوتا گر وہ شوخِ خود نما سرگرمِ آرائش
اُٹھاتا ہاتھ خورشیدِ فلک آئینہ داری سے

رواں ہے شمع کے اشکوں میں چربی ناک گھل گھل کر
بہا جاتا ہے دل خوں ہو کے اپنا اشکباری سے

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی
کہ نوبت دمِ شماری کی ہتی شب اختر شماری سے

جو پُوچھے زاہدِ خشک اپنی دارو۔ کہدو مے پی لے
اگر پرہیز کو پُوچھے۔ کہو پرہیزگاری سے

قفس کو لے اُڑیں صیاد اسیرِ مضطرب تیرے
خبر گُل کی اگر اُڑتی سُنیں بادِ بہاری سے

کبھی گر سر اُٹھا اپنا تو جوں اشکِ سرِ مژگاں
زمیں کو جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے

اُٹھائے جاؤں کبتک داغ۔ کاش اُنکے عوض ہوتے
مری چھاتی پہ پتھر سنگدل دو چار بھاری سے

لگی بھی گر زمیں کو بیٹھنے تیرے تفتہ جانوں کی
تو مثلِ برق اُٹھ بھاگے وہیں پھر بیقراری سے

نہیں آتا نہ آئے رحم اے ذوق اُس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے مری آہ و زاری سے

یہ غزل بھی ایام شباب کی ہے۔ شاہ نصیر کے عہد میں کہی تھی۔

یار ہنسنے حال پر ہم دلفگاروں کے لگے
کاش کے ایسے ہی یارب دُکھو یاروں کے لگے

اور بھی چمکا سمندِ وحشت اپنا دشت میں
تیز جوں مہمیز نشتر جب کہ خاروں کے لگے

کس کی کفش پا پہ دیکھے ہیں ستارے اے فلک
رہتے ہیں دیدے زمیں کو جو ستاروں کے لگے

بزم میں گر وہ اُلٹ دے روئے روشن سے نقاب
چھوٹنے مہتاب مُنہ پر ماہ پاروں کے لگے

اِس طرح در پے دلوں کے ہیں ترے چشم و نگاہ
جوں شکار افگن پھریں پیچھے شکاروں کے لگے

سرزمیں باغِ الفت میں ترے اے فتنہ گر
نخلِ قامت جب ترے سینہ فگاروں کے لگے

ٹہنیاں تیروں کی نکلیں پھوٹے سوفاروں کے گل
خنجروں کے برگ نکلے پھل کٹاروں کے لگے

ہو اگر گرمِ فغاں مُرغِ چمن میری طرح
آگ دم میں آشیانوں کو ہزاروں کے لگے

آئے ہم اُس بزم میں اکدم سو اُس پر سینکڑوں
تیغ طعنوں کے لگے خنجر اشاروں کے لگے

اے خدنگِ یار۔ مرہم جائیں غیرت سے نہ کیوں
مرہم آ کر زخم پر سینہ فگاروں کے لگے

ذوق صحرائے جنوں میں ہو گیا ہے گردِ باد
توسنِ وحشت کو ہیں مہمیز خاروں کے لیئے

باغِ عالم میں جہاں نخلِ حنا لگتا ہے
دِل پُر خوں کا وہاں ہاتھ پتا لگتا ہے

کیا تڑپنا دلِ بسمل کا بھلا لگتا ہے
جب اُچھلتا ہے ترے سینہ سے جا لگتا ہے

دل کہاں سیر تماشے پہ مرا لگتا ہے
دل کے لگ جانے سے جینا بھی بُرا لگتا ہے

جو حوادث سے زمانہ کے گرا۔ کب اُٹھا
نخل آندھی کا کہیں اُکھڑا ہوا لگتا ہے

دل لگی کا ہے مزا یہ کہ گزک میں اب دل
سب کبابوں سے نمک تجھکو سوا لگتا ہے

نہ شبِ ہجر میں لگتی ہے زباں تالو سے
اور نہ پہلو مرا بستر سے ذرا لگتا ہے

ہائے محتاج ہوا مرہمِ زنگار کا تو
زخمِ دل! زہر مجھے ہنسنا ترا لگتا ہے

آبِ خنجر ہے جو زہرابِ وفاداروں کو — ملک سرحد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے[۱]
قدِ مجنوں ترے بھونو کی چھڑی ہے لیلیٰ — جب ذرا جھکتا ہے سر پانو سے جا لگتا ہے

زر و زاہد ہے تو کیا - کھوٹ ابھی ہے دلمیں
ذوق اس زر کو کسوٹی پہ کسا لگتا ہے

م

اڑائی طرز نالہ کی بخشی اکیدم ترے محزوں سے — سوا اہنگ بجھے منقارِ طوطی سرخ ہے خوں سے
نہ شب آنکھوںمیں خواب آیا خیالِ خالِ شبگوں سے — رہے بیدار ساری رات ہم ایک حبِ افیوں سے
یہ دنیا ہے وہ خمخانہ کہ جس میں دورِ گردوں نے — گلِ حکمت کیٔے کتنے ہی خم خاکِ فلاطوں سے
اثر ہو نالۂ پر درد کا اتنا تو اے بلبل — کہ ٹپکے جائے شبنم - اشکِ انجم چشمِ گردوں سے
شہیدِ چشمِ میگوں ہوں ہاں کیونکر تربت پہ سب میکش — کریں آکر چراغاں ساغرِ صہبائے گلگوں سے
ترے مجنوں کے تن پر لاغری کا قطع ہے جامہ — بنا تا پیرہن ہے ایک برگِ بیدِ مجنوں سے
خدا جانے ہوے بخت اپنے واژوں اسکی زلفوں سے — دیا زلفیں ہیں اسکی واژگوں مجھ بخت واژوں سے

اُسی باغِ سخن میں ذوق جی اپنا بہلتا ہے
جہاں بوٗ عشق کی آتی ہے کچھ گلہائے مضموں سے

نگہ کا وار تھا دِل پر پھڑکنے جان لگی — چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
ترا زباں سے ملانا زباں جو یاد آیا — نہ ہائے ہائے میں تالو سے پھر زبان لگی
کسی کے دِل کا سنو حال دِل لگا کر تم — جو ہو وے دِل کو تمہارے بھی مہربان لگی
تو وہ ہلالِ جبیں ہے کہ تارے بن بن کر — رہے ہے تیری طرف چشمِ یک جہان لگی
خدا کرے کہے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی — کہ زلفِ اے بتِ بدکیش تیرے کان لگی
اُڑائی حرص نے آکر جہاں میں سب کی خاک — نہیں ہے کسکو ہوا زیرِ آسمان لگی
تمہارے ہاتھوں ہمارے دِل فگار ہیں آہ — سنانِ خنجر و پیکان کی ہے وہ کان لگی

[۱] بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے - کہ امراض مہلک میں گرفتار ہو کر مرجاتے ہیں - محاورہ میں کہتے ہیں - کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے - فلاں شخص فلاں سفر میں مرگیا - پانی لگا تھا -

م اڑائیں پون جادوگر - بلا سے ہم نہیں ڈرتے — ہے اپنا دم ہوا ہوتا - تری چشمِ پُر افسوں سے

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی

تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیٔ عمر
سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارہ آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اسکے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

وہ ہموں ہیں پر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
حذر دوزخ کرے جسکے شرارِ سنگِ تربت سے

وہی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
بنا واحد کے کیوں توڑیگا ملا - جمع کثرت سے

نہ سوکھے دامنِ تر ذرہ میرا - اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشید قیامت سے

دمِ تکبیر اُٹھائیے وجہاں سے ہاتھ یکباری
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسن نیت سے

اگر پوچھے کوئی مجھسے کہ کیوں ذرات نالاں ہے
تو میں کہدوں محبت سے محبت سے محبت سے

برائے شوکتِ دنیا نہ لیجو عارِ دیں زاہد
سمجھیو شوکۃ العقرب کو بہتر ایسی شوکت سے

نمک ہو مشک ہو یا سودہ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے

پڑھو گر فاتحہ تم آکے مرقد پر شہیدوں کے
تو یاس اُٹھکر اشارہ کردے انگشتِ شہادت سے

حریصونکو نہیں جا - وسعت آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلا دے فراغت سے

الف کو تیری قامت کے کیا اُستادِ قدرت نے
مزیں صفحۂ ہستی پہ رعنائی کے خلعت سے

لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
مجھے زخمی کیا ہے کسنے ابرو کی اشارت سے

بہت اچھا کیا مجھ کو کیا گر قتل قاتل نے
کہ ہو و یگانہ عاشق اب کوئی اور اُسپہ عبرت سے

علاجِ زخمِ حسرت سے مرا تیزابِ تیغ اس کا
نہیں سنگِ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے

اگر آرائش ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
بھلا باطن میں رتبہ کیا ہے اسکو نیک طینت سے

ہوئی حرفوں میں گو یک نقطہ زحمت سے سوا رحمت
عدو میں ہے مگر رحمت زیادہ ہوتی ہے زحمت سے

زبان ریختہ کر دی زبانِ اہلِ ولایت کی
محبت ذوق کو ازبسکہ ہے شاہِ ولایت[۱] سے

۱ حاشیہ کے لیئے دیکھو صفحہ ۲۱۸ ؛

غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے - ردیف کو دیکھو - عہد مذکور کا محاورہ سناتی ہے

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے جائے ہے
البتہ آدمی - سو کبھی آئے جائے ہے

جو اُس گلی میں مثلِ صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اسکو تمنائے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے
پر میرے پاس اسے بھی کوئی لجائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغنِ اشکِ گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے ایک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا میرے پرچائے جائے - ہے

ابرِ مژہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

فوارہ سے بجا ہے تواضع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ نہوڑائے جائے ہے

کیا حالِ جسمِ زار کہوں - سوزِ عشق سے
ایک بل ہے - کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمون اضطراب کا ہے یہ بھی ایک اثر
وہ مرغِ نامہ بر کو جو پھڑکائے جائے ہے

تابوت ترے کشتہ کو پینس سے کم نہیں
کیا پانو اپنے چین سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا! نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوقِ مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائیگی نہ ذوق
دل ہیں جو درد ہے سو کوئی ہٹائے جائے ہے

رُ وائے

کچھ نہیں چاہیئے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے

اُسنے مارا رُخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیئے جائے کفن چادرِ مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

چمن دہر میں جوں سبزۂ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے دیا کرتے ہیں زہراب مجھے

ہیں وہ مجنوں جس کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

سفرِ عمر ہے یارب کہ ہے طوفانِ بلا
ہر قدم سیلِ حوادث کا ہے گرداب مجھے

سال ۳۰۔ ۴۰ برس ہوئے کہ اہل ولایت مرد تازہ ولایت شمشیر ولایت عناب ولایتی - مرد ولایتی - اور مرد ولایت زا - اور بلی ولایتی کہتے تھے - اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے - اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں - دیکھو لفظ وہی ہے - مفہوم بدل گیا - آزاد

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغِ سیہ تاب مجھے

کُنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دعا سے کیا کیا
دلِ بیتاب کو میں اور دلِ بیتاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا
لیوے اِس طرح سے زانو کے تلے اب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم میری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہ خواب مجھے

گردشِ چرخ ہے اے ذوق مہندس کے لیے
آسماں اسکو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیر اُس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
انسان وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے۔ گلِ عبہر میں گھر کرے

یوں میرے دل میں چبھتی ہے مژگانکی اسکے تاب
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

گلگشتِ چمن نہیں کہ گئے صبح شام آئے
دل ہو کہ اُس کی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوشِ گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سینکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گردباد کے مجنوں نے گھر کیا
سر گشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگِ رُخ پہ اُسکے جما ہے مرا خیال
جس طرح رنگ برگ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا تھا کیا بھلا
یہ رنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دُزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دل جسکا گم ہوا کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پر ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں۔ ابھی آئے ابھی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں کھلاتا ذوق شوق
سن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہیں جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ ایک زمانے سے
نہیں اس پر بھی اے ظالم ترا ایمان ٹھکانے سے

ستمگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے

ڈھلینگے شمع کے سانچہ میں گذرے سر پہ جو گذرے
بہینگے آنسو وہ نہیں انکے آگے اس بہانے سے

پڑے تسبیحِ زاہد پر نگاہِ مست اگر تیری
تو ٹپکے بادۂ انگور اسکے دانے دانے سے

تمہاری زلف کے کوچہ میں پھرتا ہے وہ دیوانہ
بنا لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانہ سے

کہاں جاؤنگا اڑ کر طائرِ بے بال و پر ہوں میں
قفسِ صیاد کا بہتر ہے مجھ کو آشیانہ سے

نہ کیجو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جاں غش لبِ جاں بخش پر - دل غش خطِ مشکیں پہ ہے
عیسائی اپنے دیں پہ ہے - موسائی اپنے دیں پہ ہے

دے سیمیں کی صورت دکھا - تو ہنس کے دانت اپنے فدا
یاسین - کیا پڑھوا رہا - قاتل مرے بالیں پہ ہے

بلبل کا دل ہے خوں فشاں - ہیں عشق کی نیرنگیاں (۱)
سرخی رنگِ گل کہاں - یہ دامنِ گلچیں پہ ہے

حرفِ زبانی ہو کہ خط - قول اُن کا سچ ہو یا غلط
مہری تو اب تسکیں فقط - اے دل تری تسکیں پہ ہے

ہے خوشۂ انگور یا - کرتا ہے دل پہ آبلہ

(۱) بلبل کا خوں ہے گلفشاں

صد خندۂ دنداں نما - شب خوشۂ پرویں پہ ہے
دو جام مے بھر کر چڑھا - پھر دیکھ کیفیت ہے کیا
یہ خوب عینک حق نما - چشمِ حقیقت بیں پہ ہے
ہو کوہ کے چشموں سے وہاں - پانی نہ کیوں شیریں رواں
دی جان شیریں کھو جہاں - فرہاد نے شیریں پہ ہے
میں کیا کروں اظہارِ غم - ہے بارِ غم پُر بارِ غم
دن رات ایک انبارِ غم - میرے دلِ غمگیں پہ ہے
صیقل نہ ہو گر تیغ پر - جوہر پہ ہو کس کو نظر
اے ذوق یہاں قدرِ ہنر - آرائش و تزئیں پہ ہے

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے
لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے

دلا ربط اُس سے رکھنا کم ابھی سے
جتا دیتے ہیں تم کو ہم ابھی سے

ترے بیمارِ غم کے ہیں جو غم خوار
برستا اُن پہ ہے ماتم ابھی سے

غضب آیا ہلیں گر اُس کی مژگاں
صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے

نہیں ہے دیر اگر جانے میں اُن کے
نہیں اپنے بھی دم میں دم ابھی سے

بہے آنسو تو دامن کیا کہیں گے
ہوئی ہے آستینیں پُر نم ابھی سے

میرے لاشہ پہ بھی اُس بدگماں نے
کہا! کیوں جی! چُرایا دم ابھی سے

تمہارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا
وگرنہ اشک جاتے تھم ابھی سے

لگے سیسہ پلانے مجھ کو آنسو
کہ ہو بنیادِ غم محکم ابھی سے

وہ شاید منہ کھلے پہ جائیں گے آج
کہ چھایا دل پہ ابرِ غم ابھی سے

نکلتے ہی دم اُٹھواتے ہیں مجھ کو
ہوئے بیزار کیوں ہمدم ابھی سے

ابھی دل پر جراحت سو نہ دو سو
لے آئے دوستو مرہم ابھی سے

کیا ہے وعدۂ دیدار کس نے   کہ ہے مشتاق ایک عالم ابھی سے

مُوا جانا مجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خورم ابھی سے

حالت نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی   ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی
کوچہ میں آپڑے ہیں ترے خاک ہو کے ہم   یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
قاصد جواب جان مری دیکھی مجھے   پر منتظر ہیں آنکھونمیں خط کے جواب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی مُنہ چھپا کے تم   دابے ہوئے بغل میں صُراحی شراب کی

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقتِ ہُو حق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغازِ شباب کا ہے۔

قفلِ صد خانہ دِل آیا جو تو ٹوٹ گئے   جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے
خارِ غم دِل سے کسی طرح نہ نکلا اے عشق   ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے
چارہ گر سوزنِ تقدیر ہیں کچھ اور ہیں تار   جیب کے تار جو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے
سینکڑوں کاسۂ سر ہر میں مانندِ حباب   کبھو اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے
تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے   ہاتھ کیا اُسکے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم   رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے
کیونکہ بن کشتیٔ مے کیجئے سیرِ دریا   میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے
دیکھکر سُرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں   ہیں صنم خانوں میں زنار گلو ٹوٹ گئے
تیرے ہاتھونمیں برنگِ گل بازی آخر   بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
چشمِ مخمور کے ایک جام میں سب یوں کے   رات سر رشتۂ اعمالِ نکو ٹوٹ گئے
تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دِل سے   تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے
کیا بیاں تجھ سے کروں ذوق شکستِ دِل کا   کہ مری خاک سے بن بن کے سبو ٹوٹ گئے

مژۂ تر پہ اُمنڈ کر جو شب آئے آنسو
شدّت گریہ سے مو بر سرِ مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوڑتا تیروں کو ترے
کھنچے بھی دِل سے جو سوفار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق ہے کیا بارور اللہ اللہ
بے ثمر لائے کہ سروِ لبِ جو ٹوٹ گئے

کہہ بہ تبدیلِ قوافی غزل ایک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے بھٹلاتا ہے تو ٹوٹ گئے

کس کے موشانہ ہیں اے سست ہوس ٹوٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
ہائے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آبلۂ پا پہ ہے مژگاں پیدا
پاؤں میں چبھ کے مرے خار زبس ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اب کے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

رہ گئے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پر بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

نو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیّاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم - ایسی ہوئی گم آواز
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

ہم اوّل ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ ولادت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دودِ آلود سمجھے
کہ ٹانکے عشق حلوائے بے دود سمجھے

تری مانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے زخم - دِل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آگے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دِل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم اُن پہ
ہم اُلفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دِل کا بازارِ اُلفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلووں سے چمن میں رونق اے گلرو بڑھے
شاخِ گلبن میں بڑھے گل گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں سے بڑھاتے دشت میں
ضعف سے مدت میں جوں شاخِ سرِ آہو بڑھے

کہہ رہا ہے حسن کے دیواں میں خطِ پشتِ لب
ایک مطلع اور زیرِ مطلع آبرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت گر نہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے

تجھ کو دشمن وہاں شرارت سے جو بھڑکاتے ہیں روز
چاہتے ہیں اور شر اے شوخِ آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی دی ہے داروئے فرحت فزا
جس کے ایک قطرہ سے سیروں جسم میں لوہو بڑھے

یوں ورم گریہ ہوا دل سے مرے نالہ بلند
جس روش پانی کے باعث سرد آبِ جو بڑھے

حسنِ کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جامِ جم سے قدرِ کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی طپش اور قہر ہے غیروں کے ساتھ
گرمیِ صحبت تری اے شوخِ آتش خو بڑھے

چہرۂ رخ پر نورِ قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے
حسن تیرا روز بر روز اے ہلال ابرو بڑھے

کچھ تبِ غم کو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب
روز نسخہ میں اگر خرفہ گھٹے کاہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی اُنسے رسم و رہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غمِ جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اُنسے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جبتک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمہاری سب عشق میں ہمسے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے
گالی کے ساتھ اُسنے ایک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہیگا - کچھ کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں مجھے تو اے بیخودی سنائی

کہنے نہ پائے اُس سے ساری حقیقت ایکدن
آدھی کبھی سنائی - آدھی کبھی سنائی

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیٔ عمر

نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی
سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارہ آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اسکے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

وہ ہوں میں پر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
وہی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
نہ سوکھے دامنِ تر ذرہ میرا۔ اور جوں اختر
دمِ تکبیر اٹھائے وہ جہاں سے ہاتھ بیکاری
اگر پوچھے کوئی مجھسے کہ کیوں دنیا سے ناراض ہے
برائے شوکتِ دنیا نہ لیجو عارِ دیں زاہد
نمک ہو مشک ہو یا سودۂ الماس تم چھڑکو
پڑھو گر فاتحہ تم آکے مرقد پر شہیدوں کے
حریصوں کو نہیں جا۔ وسعت آبادِ قناعت میں
الف کو تیری قامت کے کیا اُستادِ قدرت نے
لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
بہت اچھا کیا مجھ کو کیا گر قتل قاتل نے
علاجِ زخمِ حسرت ہے مرا تیز آب تیغ اس کا
اگر آرائشِ ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
ہوئی حرفوں میں گو یک نقطۂ رحمت سے سوا زحمت

حذر دوزخ کرے جسکے شرارِ سنگِ تربت سے
بنا واحد کے کیوں توڑیگا ملّا۔ جمعِ کثرت سے
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشید قیامت سے
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسنِ نیت سے
تو میں کہدوں محبت سے محبت سے محبت سے
سمجھیو شوکۃ العقرب کو بہتر ایسی شوکت سے
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے
تو بس اٹھکر اشارہ کردے انگشتِ شہادت سے
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلادے فراغت سے
مزین صفحۂ ہستی پہ رعنائی کے خلعت سے
مجھے زخمی کیا ہے کسنے ابرو کی اشارت سے
کہ ہو ویگا نہ عاشق اب کوئی اور اسپہ عبرت سے
نہیں سنگِ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے
بھلا باطن میں رتبہ کیا ہے اسکو نیک طینت سے
عدو میں ہے مگر رحمت زیادہ ہوتی ہے زحمت سے

زبان ریختہ کردی زبانِ اہلِ ولایت[1] کی
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

[1] حاشیہ کے لیئے دیکھو صفحہ ۲۱۸

غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے ۔ ردیف کو دیکھو ۔ عہد مذکور کا محاورہ سُناتی ہے

ملنا ہمارا اُن کا تو کب جائے جائے ہے
البتہ آدمی ۔ سو کبھی آئے جائے ہے

جو اُس گلی میں مثلِ صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اسکو تمنائے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے
پر یہ ہے پاس اِسے بھی کوئی کھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشکِ گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے ایک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا میرے پرچائے جائے ہے

ابرِ مژہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

فوارہ سے بجا ہے تواضع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ نہوڑائے جائے ہے

کیا حالِ جسمِ زار کہوں ۔ سوزِ عشق سے
ایک بال ہے ۔ کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمون اضطراب کا ہے پر بھی ایک اثر
وہ مرغِ نامہ بر کو جو پھڑکائے جائے ہے

تابوت تیرے کشتہ کو پہیں سے کم نہیں
کیا پانو اپنے چین سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا! نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوقِ مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائیگی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے جائے ہے

ردوائے

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے

اُسنے مارا رُخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیے جائے کفن چادرِ مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

چمن دہر میں جوں سبزۂ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے دیا کرتے ہیں زہراب مجھے

ہیں وہ مجنوں جس کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

سفرِ عمر ہے یارب کہ ہے طوفانِ بلا
ہر قدم سیلِ حوادث کا ہے گرداب مجھے

ملہ ۳۰-۴۰ برس ہوئے کہ اہلِ ولایت مردِ تازہ ولایت ۔ شمشیر ولایت عناب ولایتی ۔ مرزو لایتی ۔ اور مرد ولایت زاد ۔ اور بلی ولایتی کہتے تھے ۔ اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے ۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں ۔ دیکھو لفظ وہی ہے ۔ مفہوم بدل گیا ۔ آزاد

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغِ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دو سے کیا کیا
دلِ بیتاب کو ہیں اور دلِ بیتاب مجھے

ہیں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا
لیوے اِس طرح سے زانو کے تلے اب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم میری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

گردشِ چرخ ہے اے ذوق مہندس کیلئے
آسماں اسکو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیر اُس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
اِنسان وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے۔ گل عبہر میں گھر کرے

یوں میرے دل میں چھپتی ہے نہ انکی اسکے تاب
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

گلگشتِ چمن نہیں کہ گئے صبح شام آئے
دل ہو کہ اُس کی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوشِ گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سینکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گردباد کے مجنوں نے گھر کیا
سرگشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگِ رُخ پہ اُسکے جما ہے مرا خیال
جس طرح رنگ برگ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا تھا کیا بھلا
یہ زنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دُزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دِل جسکا گم ہوا کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اِس بساط پر ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں۔ ابھی آئے ابھی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں کھِلاتا ذوقِ شوق
نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ

سُن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے
تم بھی چلے چلو یونہیں جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دین تونے اگرچہ ایک زمانے سے
ستمگر تونے رو کا سب کو میرے پاس آنے سے
ڈھلینگے شمع کے سانچہ میں گذرے سر پہ جو گذرے
پڑے تسبیحِ زاہد پر نگاہِ مست اگر تیری
تمہاری زُلف کے کوچے میں پھرتا ہے جو دیوانہ
کہاں جاؤنگا اڑ کر طائرِ بے بال و پر ہوں میں

نہیں اس پر بھی اے ظالم ترا ایمان ٹھکانے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے
بہینگے آنسو وہ نمیں انکے آگے اس بہانے سے
تو ٹپکے بادۂ انگور اسکے دانے دانے سے
بنا لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانہ سے
قفسِ صیاد کا بہتر ہے مجھ کو آشیانہ سے

نہ کیجو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جاں غش لبِ جاں بخش پہ - دل غش خطِ مشکیں پہ ہے
عیسائی اپنے دیں پہ ہے - موسائی اپنے دیں پہ ہے

ئے سیمیں کی صورت دکھا - تو ہنس کے دانت اپنے ذرا
یاسمیں - کیا پڑھوا رہا - قاتل مرے بالیں پہ ہے

بُلبُل کا دل ہے خوں فشاں - ہیں عشق کی نیرنگیاں
سُرخی رنگِ گل کہاں - یہ دامنِ گلچیں پہ ہے

حرفِ زبانی ہو کہ خط - قول اُن کا سچ ہو یا غلط
میری تو اب تسکیں فقط - اے دِل تری تسکیں پہ ہے

ہے خوشۂ انگور یا - کرتا ہے دِل پہ آبلہ

صد خندۂ دنداں نما - شب خوشۂ پرویں پہ ہے

دو جام مے بھر کر چڑھا - پھر دیکھ کیفیت ہے کیا
یہ خوب عینک حق نما - چشمِ حقیقت بیں پہ ہے

ہو کوہ کے چشموں سے وہاں - پانی نہ کیوں شیریں رواں
دی جان شیریں کھو جہاں - فرہاد نے شیریں پہ ہے

میں کیا کروں اظہارِ غم - ہے بارِ غم پُر بارِ غم
دن رات ایک انبارِ غم - میرے دلِ غمگیں پہ ہے

صیقل نہ ہو گر تیغ پر - جوہر پہ ہو کس کو نظر
اے ذوق یہاں قدرِ ہنر - آرائش و تزئیں پہ ہے

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے
لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے

دلا ربط اُس سے رکھنا کم ابھی سے
جتا دیتے ہیں تم کو ہم ابھی سے

ترے بیمارِ غم کے ہیں جو غمخوار
برستا اُن پہ ہے ماتم ابھی سے

غضب آیا ہلیں گر اُس کی مژگاں
صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے

نہیں ہے دیر اگر جانے میں اُن کے
نہیں اپنے بھی دم میں دم ابھی سے

بہے آنسو تو دامن کیا کہیں گے
ہوئی ہے آستینیں پُرنم ابھی سے

میرے لاشہ پہ بھی اُس بدگماں نے
کہا! کیوں جی! چرایا دم ابھی سے

تمہارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا
وگرنہ اشک جاتے تھم ابھی سے

لگے سیسہ پلانے مجھ کو آنسو
کہ ہو بنیادِ غم محکم ابھی سے

وہ شاہد منہ کھلے پر جائیں گے آج
کہ چھایا دل پہ ابرِ غم ابھی سے

نکلتے ہی دم اُٹھواتے ہیں مجھ کو
ہوئے بیزار کیوں ہمدم ابھی سے

ابھی دل پر جراحت سو نہ دو سو
لے آئے دوستو مرہم ابھی سے

کیا ہے وعدۂ دیدار کس نے ۔۔۔ کہ ہے مشتاق ایک عالم ابھی سے

مُوا جانا مجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خرم ابھی سے

حالتِ نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی ۔۔۔ ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی
کوچہ میں آ پڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم ۔۔۔ یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
قاصد جواب جان مری دیکھی مجھے ۔۔۔ پر منتظر ہیں آنکھوں میں خط کے جواب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی مُنہ چھپا کے تم ۔۔۔ دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتایئے
معلوم ہے حقیقتِ ہُو حق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغازِ شباب کا ہے۔

قفلِ صد خانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے ۔۔۔ جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے
خارِ غم دل سے کسی طرح نہ نکلا اے عشق ۔۔۔ ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے
چارہ گر سوزنِ تقدیر ہیں کچھ اور ہیں تار ۔۔۔ جیب کے تار جو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے
سینکڑوں کاسۂ سر ہیں مانندِ حباب ۔۔۔ کبھو اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے
تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے ۔۔۔ ہاتھ کیا اُسکے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم ۔۔۔ رات یارو تھے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے
کیونکہ بن کشتیٔ مے کیجئے سیرِ دریا ۔۔۔ میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے
دیکھکر سُرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں ۔۔۔ ہیں صنم خانوں میں زنّار گلو ٹوٹ گئے
تیرے ہاتھوں میں برنگِ گل بازی آخر ۔۔۔ بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
چشمِ مخمور کے ایک جام میں سب بادہ کشے ۔۔۔ رات سر رشتۂ اعمالِ نکو ٹوٹ گئے
تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دل سے ۔۔۔ تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے
کیا بیاں کیجئے گردشِ دورِ شکستِ دل کا ۔۔۔ کہ مری خاک سے بن بنکے سبو ٹوٹ گئے

مژۂ تر پہ اُمنڈ کر جو شب آئے آنسو
شدّتِ گریہ سے مو بر سرِ مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوڑتا تیرو نکو ترے
کھنچے بھی دِل سے جو سوفار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق ہے کیا بارور اللہ اللہ
بے ثمر لائے کہ سروِ لبِ جو ٹوٹ گئے

کہہ بہ تبدیلِ قوافی غزل ایک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے بٹھلاتا ہے تو ٹوٹ گئے

کس کے موشانہ ہیں اے سست ہوس ٹوٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
ہائے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آبلہ پا پہ ہے مژگاں پیدا
پانوں میں چبھ کے مرے خار زبس ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اب کے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

رو نگٹے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پر بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

تو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم۔ ایسی ہوئی گم آواز
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

ہم اوّل ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ ولادت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دودِ آلود سمجھے
کہ بھتے عشق جلوائے بے دود سمجھے

تری مانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے زخم۔ دِل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آگے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دِل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم اُن پہ
ہم اُلفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دِل کا بازارِ اُلفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلوہ سے چمن میں رونق اے گلرو بڑھے
شاخِ گلبن میں بڑھے گل۔ گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں سے بڑھائے دشت میں
ضعف سے مدت میں جوں شاخِ سرِ آہو بڑھے

کہہ رہا ہے حسن کے دیواں میں خطِ پشتِ لب
ایک مطلع اور زیرِ مطلع ابرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت گر نہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے۔ سر کے ہمارے مو بڑھے

تجھ کو دشمن وہاں شرارت سے جو بھڑکاتے ہیں روز
چاہتے ہیں ور شرر اے شوخِ آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی وہ ہے داروئے فرحت فزا
جس کے ایک قطرہ سے سیروں جسم میں لوہو بڑھے

یوں ورم گریہ ہوا دل سے مرے نالۂ بلند
جس روش پانی کے باعث سرو آبِ جو بڑھے

حسنِ کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جامِ جم سے قدرِ کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی طپش اور قہر ہے غیروں کے ساتھ
گرمیِ صحبت تری اے شوخِ آتش خو بڑھے

چرخ پر نورِ قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے
حسن تیرا روز بروز اے ہلال ابرو بڑھے

کچھ تبِ غم کو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب
روز نسخہ میں اگر خرفہ گھٹے کاہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی ان سے رسم و راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غمِ جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اُن سے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جبتک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمہاری سب عشق ہیں ہمیں سے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اس سے
گالی کے ساتھ اُسنے ایک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہیگا۔ کچھ کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں مجھے تو اے بیخودی سنائی

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت ایکدن
آدھی کبھی سنائی۔ آدھی کبھی سنائی

صورت دکھائے اپنی دیکھیں وکس طرح سے — آواز بھی نہ جس نے ہم کو کبھی سنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا پھر اُسنے ہم کو کھوٹی کھری سنائی

ہنگام بوسہ گرم جو وہ ایک ذری ہوئے — شکر تو تھی پسینہ سے شکر تری ہوئے
ثبت اِس بیاضِ چشم میں ہیں خطِ سُرمہ سے — جو انتخاب نسخۂ افسوں گری ہوئے
دکھلائے ہم نے لیکے جو دامن پہ دُرِ اشک — قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے
ایک خال زیرِ زلف سے ظاہر مرے لیئے — اے یار سو طریقۂ بد اختری ہوئے
جلجائے خاک وحشیٔ چشمِ بتاں پہ گھاس — لیکن ہرن کھری[۱] نہ ہے بن ہری ہوئے
کچھ رکھتے آدمیت اگر ہوتے آدمی — یہ حور وش تو حور ہوتے یا پری ہوئے
ہم جیتے جی جہاں سے معدوم ہو گئے — اتنے نظر سے گم بسبب لاغری ہوئے
رسوا نہ ہوتے کرتے نہ گر جیب و سینہ چاک — ہم آپ اپنی باعث پردہ دری ہوئے
مطلب نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے ہے کام — دل دیجے اے صنم تجھے سب سے بری ہوئے
طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہمقریں — ہر چند سو قرآن مہ و مشتری ہوئے

اے ذوق آج سامنے اُس چشمِ مست کے
باطل سب اپنے دعوے دانش وری ہوئے

غزل مرقومۃ الذیل پر نظرِ ثانی کی شعاع نہیں پڑی۔

ایک صدمہ دردِ دل سے مری جان پر تو ہے — لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے
آنا ہے اُن کا گرچہ قیامت پہ منحصر — ہم خوش ہیں یہ کہ آنیکی اُنکے خبر تو ہے
ہے سر شہیدِ عشق کا زیبِ سنانِ یار — صد شکر بارے نخلِ وفا بارور تو ہے
اے شمعِ دل ہے رونے میں جلتا تو کیا ہوا — ہو جاتی رات اِس میں بلا سے بسر تو ہے

۱؎ ہرن کھری ایک گھاس ہے۔ اُسکے پتے کی شکل ہرن کے سم سے ملتی ہے۔ اسلیئے یہ نام پایا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ عاشق چشم کے دلمیں آگ لگ رہی ہے۔ قبر پہ جو سبزہ اُگے گا۔ جلجائے گا۔ ہاں ہرن کھری ضرور اُگے گی۔ کہ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں۔ اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں ؎

ہے دلمیں درد اگر نہیں ہمدرد میرے پاس
دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے

اے دل ہجوم رنج و الم سے نہ تنگ ہو
خانہ خراب خوش ہو کہ آباد گھر تو ہے

اُس بُت نے غائبانہ کہا یا نہیں کہا
چپ ہو گیا وہ بارے مجھے دیکھکر تو ہے

تُربت پہ دل جلوں کی نہیں گر چراغ و گل
سینہ میں سوزشِ دل و داغِ جگر تو ہے

کشتی بحرِ غم میرے حق میں ہے تیغِ یار
کر دیتی ہے ایک دم میں اِدھر سے اُدھر تو ہے

وہ دل کہ جسمیں سوزِ محبت نہ ہووے ذوق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جسمیں شرر تو ہے

یہ غزل عنفوانِ شباب کی ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی۔

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
بنو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خطِ غبار مجھے
سمجھتے بارے کہ ہیں اپنا خاکسار مجھے

نگہ نے اُس کی مجھے سخت بیقرار کیا
بلا سے مار دے اگر کوئی کٹار مجھے

جمالِ یار نے مر کر بھی دیکھنے نہ دیا
پُکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

تمہارے عشق میں ماہی سے تا بماہِ فلک
دکھائی دیتے ہیں دلہائے داغدار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روزِ وصل پر موقوف
تو کرنا کیا تھا نظر بندِ انتظار مجھے

عیاں ہے آئینہ رُخ پہ جب سے خطِ غبار
وہ خط ہیں لکھتے مگر در خطِ غبار مجھے

ہوائے وادیٔ وحشت مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

نہ دیتا عشق اگر چشمِ اشکبار اے ذوق
جلا چکی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

لڑکپن کی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی۔

مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

لوٹتے سینکڑوں نخچیر ہیں کیا یاد رہے
چھپرو سینہ ہیں دل کو کہ پتا یاد رہے

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند میں دے لو گرہ تا کہ ذرا یاد رہے

قاصدِ عاشقِ سودا زدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

دیکھ بھی لینا ہمیں راہ میں اور کیوں صاحب
ہم سے مُنہ پھیر کے جانا۔ یہ بھلا یاد رہے

تیرے مدہوش سے کیا ہوش و خرد کی ہو اُمید
رات کا بھی نہ جسے کھایا ہوا یاد رہے

کشتۂ ناز کی گردن پہ چھُری پھیرو جب
کاش اسوقت تمہیں نام خُدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا میری اُس کوچہ میں
تجھ سے کہہ دیتا ہوں میں بادِ صبا یاد رہے

گور تک آئے تو چھاتی پہ قدم بھی رکھدو
کوئی بیدل اِدھر آئے تو پتا یاد رہے

تیرا عاشق نہ ہو آسودہ بزیرِ طوبےٰ
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آجائیں جفا سے جو کبھی آپ تو پھر
یاد عاشق کو نہ کیجیئے گا بھلا یاد رہے

داغِ دل پر میرے پھاہا نہیں ہے انگارا
چارہ گر لیجو نہ چٹکی سے اُٹھا یاد رہے

زخمِ دل بولے ترے دیکھ نمکخواروں سے
لو بھلا کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

حضرتِ عشق کے مکتب میں ہے تعلیم کچھ اور
یہاں لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

گر حقیقت میں ہے رہنا تو نہ رکھ خود بینی
بھولے بندہ جو خودی کو تو خُدا یاد رہے

عالمِ حسن خدائی ہے بتوں کی اے فوق
چلکے بُت خانہ میں بیٹھو کہ خُدا یاد رہے

چشمِ قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچے میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے

کشتۂ زُلف کے مرقد پہ تو لے لیلیٰ وش
بیدِ مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے

خاکساری ہے عجب وصف کہ جوں جِن ہو سوا
ہو صفا اور دلِ اہلِ صفا یاد رہے

ہو یہ لبیکِ حرم یا بہ اذانِ مسجد
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ [لہ]
دیکھیئے کبتک اِنہیں میری خطا یاد رہے

لہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۸

دو ورق ہیں کفِ حسرت کے دو عالم کا ہے علم
سبقِ عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے بدل اُسنے
پر خدا ہے کہ اُسے نام مرا یاد رہے

طائرِ قبلہ نما بن کے کہا دِل نے مجھے
کہ تڑپ کر یونہی مر جائیگا جا یاد رہے

جب یہ بیدار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے
کاش اسوقت انہیں نام خدا یاد رہے

ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد
بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

محو اِتنے بھی نہ ہو عشقِ بتاں میں اے ذوق
چاہیئے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر عالم تصویر کو دیکھو
تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے

ہے شانہ کہ میرا دل دیوانہ ہے اُلجھا
معلوم نہیں زلفِ گرہگیر میں کیا ہے

پارہ کی جگہ کشتہ اگر ہو دلِ بیتاب
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اِتنی چھری تیز
اب باقی بھلا اِس ترے نخچیر میں کیا ہے

کچھ سلسلۂ جنبانِ جنوں ہے ترا مجنوں
غُل دیکھ بپا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

بیٹھا ہے درِ کعبہ پہ حیراں ترا شیدا
لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے

صیاد عبث گرد ہے تو اسکے شب و روز
تو دیکھ تو کچھ اس ترے نخچیر میں کیا ہے

ہے صیدِ نگہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر
اِس تیر میں کیا لطف ہے اُس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے۔ نہ کھلے گا
کیا جانے دل عاشقِ دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور ہم تہِ خنجر
تاخیر ہو کیوں ؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اُترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا
کیا جانے اُس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دمِ ذبح
لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

سلہ اس وقت خطائی کاغذ بھی عمدہ کاغذوں میں تھا۔ غنیمت ہے۔ اب کشمیری تو باقی ہے۔ ۷۰-۸۰ برس کی عمر میں دنیا کی حالت ایسی بدل گئی ہے۔

ذوق اس لبِ شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا
کیا کہیے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

پری رو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ جب وہ ان بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھونکے یہاں وقتِ سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسیکی فندقیں یاد آگئیں ہیں ورنہ مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے

جو دیں ہیں گالیاں اُس نے زبانکو آج کیا کہیے
کبھی نادم ہم اسکو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگِ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے ایکے جان کل حضرتِ دل بیٹھے حیراں ہیں
پریشاں ورنہ جوں گردِ سفر ایسے نہ ہوتے تھے

کتابِ دل شرارِ عشق سے ہے جل اُٹھی شاید
کہ مضموں سوز دلکے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے آبلوں میں آب ہے یا آبداری ہے
کہ پہلے خارِ صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ تھے گذرے
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

زمانہ میں ہیں سنتے شور مدت سے قیامت کا
پر اس قامت سے جو ہیں شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے شعر سن کر ذوق جیسے بزمِ عالم میں
ہوئے قائل ہیں اب اہلِ نظر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
نکالے پر ہے مثلِ ماہیٔ تصویر پہلو سے

نہ لے اے ناوک افگن دلکو میرے چیر پہلو سے
کہ وہ تو جا چکا ساتھ آہ کے جوں تیر پہلو سے

دلِ سیپارہ کو لے ٹانک تعویذ و نمیں ہیکل سے
نہ سرکا یہ حمائل اے بتِ بے پیر پہلو سے

وہ ہوں بے دست و پا بسمل رسائی جب نہ ہاتھ آئی
کیا تا پائے قاتل از تہ شمشیر پہلو سے

اسیرِ زلف دیوانے ہیں دیکھ اے پاسباں شبکو
دبا کر بیٹھ اُن کے پاؤں کی زنجیر پہلو سے

مصورِ لیلیٰ و مجنوں کی ناکامی پہ حیراں ہیں
کبھی بیٹھا نہ ملکر پہلوئے تصویر پہلو سے

یہ دل لب تشنۂ تیغ یار کا ہے رات بھر کرتا
صدائے العطش جوں نالۂ شبگیر پہلو سے

عجب حسرت کا عالم تھا کہ مجنوں کہتا تھا ہیہم
چھٹے پہلو مرے محمل کا یا تقدیر پہلو سے

نہ کہنا استخواں انکو یہ عالم لاغری کا ہے
کہ ہے دکھلا رہا میرا دلِ دلگیر پہلو سے

خیالِ آبروئے جاناں نہیں دل بھولتا اکدم
سپاہی ہے جدا کرتا نہیں شمشیر پہلو سے

تمام اہل سخن بزمِ سخن میں ذوق حیراں ہیں
ملا جو قافیہ تو نے کیا تحریر پہلو سے[1]

برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لیگئی
کچھ جو خاکستر بچا آندھی اُڑا کر لیگئی

اسکے قدموں تک نہ بیتابی بڑھا کر لیگئی
ہائے دو چلنے دیئے اور پھر ہٹا کر لیگئی

ناتوانی ہم کو ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر لیگئی
چیونٹی سے چیونٹی دانہ چھڑا کر لیگئی

صبح رُخ سے کون شامِ زلف میں جاتا تھا آہ
اے دل شامت نہ وہ شامت لگا کر لیگئی

خون سے فرہاد کے رنگیں ہوا دامانِ کوہ
کیوں نہ موجِ شیر یہ صبا چھڑا کر لیگئی

تم نے تو چھوڑا ہی تھا اے ہمرہانِ قافلہ
لیکن آوازِ جرس ہم کو جگا کر لیگئی

نوکِ مژگاں جب ہوئی سینہ فگاروں سے دوچار
پارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لیگئی

دیکھی کچھ دل کی کشش لیلیٰ کہ ناقہ کو ترے
سوئے مجنوں آخرش رستہ بھلا کر لیگئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہمیں دم بھر کے بعد
بدگمانی انکے گھر سو گھر پھرا کر لیگئی

واہ اے سوزِ دروں کوچہ میں اسکے برقِ آہ
رات ہم کو ہمرہِ مشعل دکھا کر لیگئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا
کیا کہوں تقدیر اُسے کیونکر اُٹھا کر لیگئی

دشتِ وحشت میں بگولا تھا کہ دیوانہ ترا
رُوحِ مجنوں بہرِ استقبال آکر لیگئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو
آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لیگئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ
دل اڑا کر لے گئی یا پر لگا کر لیگئی

ذوق مرجانے کا تو اپنے کوئی موقعہ نہ تھا
کوئے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لیگئی

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔

[1] سلہ پہلوان کا کلام ہے۔ مگر یہ پہلو جس طرح بیٹھا ہے جاننے والے ہی جانینگے! اللہ کی قدرت ہے جسکو جب چاہے دیدے

وہیں پڑھی تھی۔ اُن کی شاگردی کا تمغہ ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

حدِ رقم سے مصحفِ جبیں ہے صنم پرے
برحق ہے شاخ سدرہ سے لوح و قلم پرے

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت کہے ہے شور قیامت کو تھم پرے

کہتا ہے کسکو ناز سے تو دمبدم پرے
تو دو قدم کہے ہیں رہوں سو قدم پرے

بسمل ترے تڑپ کے بھی پہنچے نہ پاؤں تک
یا دو قدم ورے رہے یا دو قدم پرے

کیوں گرم اضطرار ہے اسدرجہ اے شرار
ہستی سے کتنی دور ہے ملک عدم پرے

پھر کر ہمارے کعبۂ دل میں غزال یار
کہتے ہیں دیکھ رہیو غزال حرم پرے

قاتل جو تیرے ہاتھ میں پٹی ہو زہر کی
مرہم کو زخم دل سے اٹھا کہیں ہم پرے

ہے موجِ ریگ بادیہ کیا۔ ایک گام میں
ہو نکے سوار کشتیٔ نقش قدم پرے

یارب کدھر کو جائے یہ جانبازِ درد و غم
باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے

اتنا بھی دم نہیں ہے کہ تیرا مریضِ غم
سر کے نظر سے صورت نقش قدم پرے

شب گھر پہ اسکے غیر نے تو آلیا تھا پر
دیوارِ بام پہ نہ چڑھے ہم کہ دھم پرے

ق

کچھ اپنی شرحِ سوزِ دل بیقرار آج
آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجئے رقم پرے

اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشِ قلم
ہاتھوں سے جا پڑا ہے چھٹ کر قلم پرے

یہ کیا شبِ وصال۔ کہ دونو بہم تو ہیں
پر ہمسے وہ ہیں بیٹھے پرے اُن سے ہم پرے

کعبہ نہیں۔ یہ کعبۂ دل ہے مقام دوست
رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے

تم آؤ گر تو آؤ۔ نہیں مجھ کو لو بلا
گھر سے تمہارے گھر ہے مرا کئے قدم پرے

برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے ناز سے
مژگاں تک اسکی آکے نگاہِ کرم پرے

میں نے کہا جو اسنے نکلتا ہے میرا دم
بولے خدا کیواسطے رکھئے یہ دم پرے

دیکھو۔ نہ جاؤ حضرتِ دل زلفِ یار میں
رستہ نہیں ہے آپکے سر کی قسم پرے

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوق
ہے اب تو یہاں سے ملک عدم دو قدم پرے

ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے
اسکے بے نشتر رگِ جاں سے لہو نکلا کرے

گر فغاں اچھا نہیں تو چپ بھی رہنا ہے برا
کچھ تو سینہ کا بخار اے دل کبھو نکلا کرے

لائے گر بادِ صبا اس زلفِ مشکیں کی شمیم
شمع کے گل سے گلِ شبو کی بو نکلا کرے

دیکھے میرے آنسوؤں کی آبداری کو اگر
آب دریا سے گہر بے آبرو نکلا کرے

چشمِ مستِ یار اگر دکھلائے تاثیرِ نظر
تا قیامت پھر دلِ آہو سے ہو نکلا کرے

اے صنم پیدا کرے جو دلمیں تیری آرزو
پھر نہ اُسکے لب سے حرفِ آرزو نکلا کرے

خطِ مشکیں کا تمہارے وصف اگر کیجے رقم
خطِ مشک افشاں قلم سے مو بمو نکلا کرے

حضرتِ دل ہم تو جب جانیں کرامات آپکی
کھا کے دھکے روز اس گھر سے عدو نکلا کرے

تیرے ترکِ چشم کو گر شوقِ خونریزی نہ ہو
باندھکر تلوار کیوں اے جنگجو نکلا کرے

خدمتِ پیرِ مغاں سے لو وہ دارو چلکے ذوق
نشۂ مے جس سے بے جام و سبو نکلا کرے

یہ غزل بھی عالمِ شباب کی ہے۔ طرحِ مشاعرہ میں لکھی تھی۔

خمِ ابرو سلہ تیرا جب یار نظر آتا ہے
کوئی کھینچے ہوئے تلوار نظر آتا ہے

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے
سرِ خورشید کا بازار نظر آتا ہے

گھر میں جو روزنِ دیوار نظر آتا ہے
چشمِ افعی مجھے بے یار نظر آتا ہے

مستِ چشم اس کا جو میخوار نظر آتا ہے
ہے تو دیوانہ پہ ہشیار نظر آتا ہے

کیا تمہیں اے اُولی الابصار نظر آتا ہے
یہاں تو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے

ضعف سے تارِ تنِ زار نظر آتا ہے
سمرا تن پہ گرد وار نظر آتا ہے

سبزۂ خطِ گلِ رخسار پہ ایک عالم ہے
خطِ ریحاں خطِ گلزار نظر آتا ہے

معنیٔ رنگ خموشی سے جو دل ہو آگاہ
برگِ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے

جتنا بیہوش ہو اتنا ہی سوا ہو آرام
مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے

سلہ خط تری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے۔

زلف کے دام میں ہے مرغِ دل آتا ہمیں یاد — جب کوئی مرغ گرفتار نظر آتا ہے
خوابِ غم میں بھی ہے آرام۔ اگر آ جائے — ہے وہ بے چین جو ہشیار نظر آتا ہے
آنکھ اُٹھا کر تو ذرا دیکھ کہ زیرِ افلاک — جو ہے سرکش وہ نگونسار نظر آتا ہے
میرے رونے پہ جو ہے دیدۂ سوزن روتا — تار اک آنسوؤں کا تار نظر آتا ہے
صیدِ بیکس پہ ترے کون ہے کہتا تکبیر — یہ تو ہوتا یوہیں مردار نظر آتا ہے
تیرے مجنوں کو ہے سامانِ جنوں آرائش — داغِ سودا گلِ دستار نظر آتا ہے
ہے غضب سرمہ نے چمکایا تری آنکھوں کو — آج فتنہ ہمیں بیدار نظر آتا ہے
بارِ احساں ہے صبا کا بھی سرِ نکہتِ گل — کون گلشن میں سبکبار نظر آتا ہے
خنجرِ موجِ تبسّم سے ترے گلشن میں — دیکھا ہر گل کو دل افگار نظر آتا ہے
میری آنکھوں میں نظر آتا ہے عالمِ ویراں — دل کا ویرانہ جو بے یار نظر آتا ہے
عالمِ دل میں کبھی آ کے فلک کو دیکھو — کیا پسِ پردۂ زنگار نظر آتا ہے
ہائے اے دستِ جنوں تارِ نفس چھوڑ دیا — تن پہ تو مجھکو نہیں تار نظر آتا ہے
بڑھ کے جو چمکا زمانہ میں دکھائی دیا کم — روزِ شب اخترِ دمدار نظر آتا ہے
جو جوانمرد علائق میں پھنسا ہے وہ مجھے — شیر پنجرے میں گرفتار نظر آتا ہے
دیکھ کر اے بُتِ مغرور یہ اندازِ ستم — شرم سے چرخ نگونسار نظر آتا ہے
کاٹنے دوڑتا ہے گھر۔ جو نہیں وہ گھر میں — حلقۂ در دہنِ مار نظر آتا ہے
دلِ پُر وسوسہ کا عقدہ ہے قفلِ وسواس — اس کا کھلنا مجھے دشوار نظر آتا ہے
مژدہ اے آبلہ پائی کہ پھر آنکھوں میں مری — دامنِ وادیٔ کہسار نظر آتا ہے
کم نمائی سے ہوا اے ماہِ لقا عید کے چاند — کہ برس میں کبھی اک بار نظر آتا ہے
دل نے ہے دیکھ لیا دفترِ تقدیر تمام — فلک اک نقطۂ بیکار نظر آتا ہے
چشمِ ساقی نے یہ میخانہ میں پھیلایا کفر — گردنِ شیشہ میں زنّار نظر آتا ہے
صحبتِ اہلِ صفا دینی ہے سرکش کو اُلٹ — نخل پانی میں نگونسار نظر آتا ہے

تنگ جو زیست سے ہیں تختہ تابوت اُنہیں | مر کے اِک تخت ہوا دار نظر آتا ہے

دُرِ مضموں ہیں ترے ذوق زبس بیش بہا
کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے

دکھلا نہ خال ناف تو اے گلبدن مجھے | ہر لالہ یاں ہے نافۂ مشک ختن مجھے
ہمدم! وبال دوش نہ کر پیرہن مجھے | کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے
پھرتا لئے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے | زنجیرِ پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے
تسبیح دور بزم میں دیکھو امام کو | بخشی ہے حق نے زیب سرانجمن مجھے
اے میرے یاسمن[۱] ترے دندانِ آبدار | گلشن میں ہیں رُلاتے گُلِ یاسمن مجھے
محرابِ کعبہ جب سے ہے تیرا خم کماں | صیدِ حرم سمجھتے ہیں ناوک فگن مجھے
ہے تن میں ریشہ ہائے نئے خشک استخواں | کیوں کھینچتا ہے کانٹوں میں اے ضعفِ تن مجھے
اے لب مسی کو پھینک - کہ نیلم ہے کم بہا | یاقوت دے دیا کوئی لعلِ یمن مجھے
ہوں شمع - یا کہ شعلہ خبر کچھ نہیں - مگر - | فانوس ہو رہا ہے مرا پیرہن مجھے
اک سرزمینِ لالہ بہار و خزاں میں ہوں | یکساں ہے داغ تازہ و داغ کہن مجھے
خسرو سے تیشہ بولا جو چاٹوں نہ تیرا خون | شیریں نہ دے خونِ سر کوہکن مجھے
رخ پر تمہارے دام جو ڈالا ہے سبزہ نے | آتا نظر ہے دیدۂ عنقا دہن مجھے
بے دل وہ ہے کہ کر دے زمیں آسماں کو خاک | ایک دم کو برق دے جو پہنا پیرہن مجھے
کوچہ میں تیرے کون نہ تھا بنتا بھلا جبر | شب چاندنی نے آکے پنہایا کفن مجھے
دکھلاتا آسماں سے ہے روئے زمیں کی سیر | اے رشکِ ماہ تیری جبیں کا شکن مجھے
رکھتا ہے چشم لطف - پہ کس کس ادا کے ساتھ | دیتا ہے جام ساقیٔ پیماں شکن مجھے
ہے جذبِ دل درست تو چاہِ فراق سے | کھینچے گی تیری زلف شکن در شکن مجھے

[۱] - اس شعر کو پڑھکر ایک دن فرمایا - کہ ایسے موقع پر اب تک زبان اردو کے شاعر اے رشک یاسمن کہتے ہیں - مگر خیر یہ بھی ایک انداز نکلا - ہوگیا تو ہوگیا - رہا تو رہا ۱۲

دکھلاتا ایک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ
اس سادہ پن کے ساتھ تیرا بانکپن مجھے

جیسے کوئیں میں ہو کوئی تارا چمک رہا
دل سوجھتا ہے یوں تہِ چاہِ ذقن سے مجھے

آگر اسے بھی دو کبھی آنکھیں ذرا دکھا
آنکھیں دکھا رہا ہے غزالِ ختن مجھے

آئے مرے چمن کہ ہوا ہیں تری ہوا
صحرائے دل ہوائے چمن در چمن مجھے

یارب یہ دل ہے یا کہ ہے آئینۂ نظر
دکھلا رہا ہے سیر و سفر در وطن مجھے

آیا ہوں نور لیکے میں بزم سخن میں ذوق
آنکھوں پہ سب بٹھائینگے اہل سخن مجھے

یہ غزل بھی آغاز شباب کی ہے۔ مضمون مطلع بھی گواہی دیتا ہے۔

مار کر تیر جو وہ دلبر جانی مانگے
کہدو ہم سے نہ کوئی دیکھے نشانی مانگے

اے صنم دیکھکے ہر دم کی تری کم سخنی
موت گھبرا کے نہ کیوں یہ خفقانی مانگے

خاک سے تشنۂ دیدار کے سبزہ جو اُٹھے
تو زبان اپنی نکالے ہوئے پانی مانگے

مار پیچاں تو بلا ہیگا مگر تو اے زلف
ہے وہ کافر کہ نہ کاٹا تیرا پانی مانگے

دہنِ یار ہو۔ اور مانگے کسی سے دلکو؟
وہ جو مانگے تو باندازِ نہانی مانگے

دل مرا بوسہ پہ پیغام نہیں ہے ہمدم
یار لینا ہے تو لے۔ اپنی زبانی مانگے

جلوہ اُس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ لے حُسنِ معانی مانگے

نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے

جفا میں بات وہ کیا حکمنہ نہیں دیتے؟
کہ دردِ جاں ہیں اب زخمِ تن نہیں دیتے

جو بولوں کچھ تو مجالِ سخن نہیں دیتے
سیوں بھی میں۔ پہ وہ سینے دہن نہیں دیتے

سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید
دکھا اُسے مرا داغِ کہن نہیں دیتے

ہیں منع کرتے ہے رونے کو یہ جو ناداں دوست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

یہ پڑ گئیں تنِ لاغر میں جھریاں ہیں مرے
کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

شہیدِ ناز کے چلمن پہ ہے نظر شاید
کہ سرمہ آنکھوں میں تم جانِ من نہیں دیتے

اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتا یارو
بتا اُسے میرا بیت الحزن نہیں دیتے

عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گذر
کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

جو مانگا آبِ دمِ تیغ اُس سے بسمل نے
تو بولا- زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

بیانِ شیخ جو ہے وصفِ حور و شعلۂ طور
ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

وہ تیر کھینچے ہے- پہلو سے کہدے اے بدلِ زار
کہ ہے نشانۂ ناوک فگن نہیں دیتے

ہو اُنکی زلف سے کیا زخمِ دل کو چشمِ امید
لگا بھلے کو وہ مشکِ ختن نہیں دیتے

پڑے ہیں دامنِ کہسار و دامنِ صحرا
تیرے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

زبان حلاوتِ اُلفت کا لے مزہ کہ نہ لے
لب اپنی حد سے گذرنے سخن نہیں دیتے

پلایا زہر- دکھایا ہے مے کا پیمانہ
یہ دھوکے اے بتِ پیماں شکن نہیں دیتے

سنبھال ناخنِ وحشت کو اب تو دستِ جنوں
کہ سینے یہ مرا چاکِ کفن نہیں دیتے

گلوں سے بن چکے جب دو نو ہاتھ گلدستہ
تو بوسے ذوق جلا تن بدن نہیں دیتے

اے صنم ہجر میں ہم جیتے بھلا پتھر تھے
سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے

وہ بھی دن یاد ہیں جب کوچۂ صنم میں اہلِ
بسترِ خاک تھا اور تکیہ کی جا پتھر تھے

دلِ مجروح نے جو کھائے جنوں میں پتھر
اسکو وہ سنگِ جراحت سے سوا پتھر تھے

پوچھا اُس بُت نے تو نکلی نہ زباں سے ایک بات
حضرتِ دل وہاں کیا بارِ خدا پتھر تھے

جن دلوں نے ہے کیا چور مرا شیشۂ دل
اے بتو دل تو نہ تھے وہ- بخدا پتھر تھے

عمر بھر کھاتا رہا سرو قدوں کے دشنام
اس شجر سے مری قسمت کے سدا پتھر تھے

کون ہمدم شبِ غربت میں تھا بیکس کا ترے
یا تو سناٹا تھا یا دیتے صدا پتھر تھے

تھے دلِ سنگ میں جبتک تو رہے قطرۂ خون
تاجِ شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے

۱؎ یہ غزل بھی شاہ نصیر مرحوم کے عہد کی ہے استاد مرحوم کی آخر عمر میں جان من اور رہا و غزلیت کے دائرہ سے نکل گئے تھے ۱۲

خاک اُس زیست پہ جب سنگِ در اسکے ہوئے
مر کے ہم خاک میں جیتے تھے تو کیا پتھر تھے

میرے نالوں نے تو پتھر سے بہائے چشمے
اے بتو تم ہی پسیجے نہ ذرا پتھر تھے

کعبۂ عشق کا اے **ذوق** کیا ہم نے طواف
آئینہ خاک تھی اور سنگ صفا پتھر تھے

دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مر کے گر خاک میں تو چھاتی پہ پتھر ہی دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاج شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھرے گر تیرے در پر تھے تو کیا پتھر تھے

کہ نہ بتخانہ میں اے شیخ بتو نکو دل سنگ
وہاں تیرے کعبہ کے اندر تھے تو کیا پتھر تھے

کتنا رویا ہوں ولیکن نہ پسیجے وہ سنگ
سنگدل گر نہ ستمگر تھے تو کیا پتھر تھے

ساقیا خاک ہے گر شیشۂ دل میرا تو کیا؟
اور بلوریں تیرے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے

سنگدل وہ رہے اے **ذوق** صداحق میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں ہونٹ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر ایک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری
شکوہ کیا کیجئے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پانو کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارۂ مصحفِ دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آئے پانو کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آکے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزن در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گہ گھٹاتا ہے گہے مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شب ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں ایک نالہ سے میں حشر بپا سو حشر
شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

تھے تمھی نکلے جو اُس دام بلا سے اے **ذوق**
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آئے تو سہی

یہ غزل بھی اُسی زمانہ کی ہے۔

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے
تم آتے آؤ نہیں نہ آؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہ دل ہے آئینہ تم ہو صورت نہیں ہے یہاں نام کو کدورت
کسی کو گھر میں بُلا بٹھاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

خلل بنائے مکانکو پہنچے تو ہوگا نقصاں مکیں کو پہلے۔
مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

غلط ہے تہمت ہے افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے
کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

گئی ہے رات اب بہت زیادہ کدھر کا کرتے ہو تم ارادہ
نہ گھر کے جانے کی اب سناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اپنے رُخ میں ہو کر رہے دن۔ ہو زلف میں شب کے عقدے گن گن
ہزار دل سے ہمیں بھلاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

مکانِ دیدہ پسند خاطر اگر نہیں ہے کہ ہونگے ظاہر
تو خیر تشریف تم نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اُسکو دو داغ مثل لالہ دیا کرو بیٹھکر اُجالا۔
بگاڑو تم اس کو یا بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہی زباں سے ہے ذوقؔ کہتا تمہارا ہے دھیان اسمیں رہنا
جدا مکان اور کیوں بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

متفرقاتِ یا

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ بہ سنگِ پہاں سے
دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

اُڑائے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
برستے پھول ہیں سر پر شرارِ سنگِ طفلاں سے

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشمِ فتاں سے
گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اُسکی مژگاں سے

چمکتی ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے
لگیگی ابرِ رحمت کی جھڑی اب چشمِ گریاں سے

یہاں تک ناتواں ہیں ہم گذر جائیں اگر جاں سے
اُٹھائے مور لاشہ کو ہمارے دستِ مژگاں سے

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے،
کہ تا ہو جائے لذّت آشنا تلخیِ دوراں سے

سب کو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے

پھرتا سرگشتہ زمانہ میں بھلا کیوں خورشید
ہوسِ گرمیٔ بازار لئے پھرتی ہے

وہ میرے اخترِ طالع کی ہے واژوں گردش
کہ فلک کو بھی نگونسار لئے پھرتی ہے

کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قاتل
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

جا کے پھرتا نہ تھا اکبار جہاں وہاں مجھکو
بے قراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

کون وقت اے وائے گذرا جی کو گھبراتے ہوئے
موت آتی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے

آتشِ خورشید سے اُٹھتا نہیں دیکھا دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سُکھلاتے ہوئے

وہ جاگے رات اور یاں ضد سے بختِ خفتہ کی
بچ گیا آخر جگر زنجیر کھڑکاتے ہوئے

چاک آتا ہے نظر پیراہن صبحِ بہار
کس شہیدِ ناز کو دیکھا ہے کفناتے ہوئے

پیشوائی کو بڑھے گرِ کششِ دل آگے
جاتے اسطرح سے اُس کوچہ میں ہیں دل اور ہم
گرچہ ہے وادیٔ عنقا سے پرے سو سو قاف
تجھ سا ناقص بھی غنیمت ہے اب اس وقت میں ذوق

دوڑے مجنوں کی طرف ناقہ سے محمل آگے
دل سے ہم آگے کبھی۔ ہم سے کبھی دل آگے
لیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے
کاملیت ہے کہاں ہو چکے کامل آگے

ناقص کا صفا کینہ سے مطلب بر آئے
فردوس میں فکر اُس لب شیریں کا گر آئے
بتخانہ میں گر آہ کروں عشق صنم سے
ممکن نہیں کم ہوئے تپ سوزِ محبت

جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے
پانی دہن چشمہ کوثر میں بھر آئے
ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے
جوں شمع مجھے لاکھ پسینا اگر آئے

نعل جب شکلِ مہِ نو ترے توسن کو لگے
بوسہ کے مانگتے ہی پھیر نے چتون کو لگے
آشیاں ہو جیو مرغانِ ہوا کا برباد

چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے
ایسے کیا لعل لب غیرت گلشن کو لگے
بند کرنے تری دیوار کے روزن کو لگے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے
آزارِ محبت کا مزہ کیا کہوں جس کی
سیراب ہو جس سے کوئی تشنہ مقصود

بے درد اگر دل بہ خدا بھی ہے تو کیا ہے
ہے درد دوا۔ دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے
اے ذوق جو وہ آبِ بقا بھی ہے تو کیا ہے

گر رخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے
فرہاد! ضرب تیشہ سے ہے سخت ضرب غم
تم دو گھڑی کو آؤ تو ہیں لب پہ جان کو

ہے مثل وہ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی
سچ پوچھئے تو چوٹ ہمیں نے کڑی سہی
ٹھیرا رکھوں کہ اور بھی یہاں دو گھڑی سہی

کیا وہ دنیا جسمیں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے
واسطے وانکے بھی کچھ یا سب ہیں کے واسطے؟

خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے
اے سکندر کسلئے؟ دو گز زمیں کے واسطے؟

ذوقؔ عاصی ہے پر اسکا خاتمہ کیجو بخیر
یا الٰہی اپنے ختم المرسلیں کے واسطے

سوز دل سے مرے نالے جو شرر بار ہوئے
مدعی جل گئے اچھا ہؤا فے النّار ہوئے

ٹکڑے اڑ جائیں قفس کے تو اڑینگے نہ کبھی
ہم ہیں صیّاد کی الفت کے گرفتار ہوئے

چمن دل سے ہوئے کم نہ گل لخت جگر
دو اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے

لڑکپن کی غزل تھی ۳۔ شعر یاد رہ گئے۔

چھپا کے پھولوں میں مُنہ صبا سے جو مُسکرائے سحر کلی ہے
تبسم اُس گل کا یاد کر کے عجب ہوئی دل کو بے کلی ہے

تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر +
دکھایا تم نے جو روئے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

بناؤ للہ چوبِ صندل سے میرا تابوت اے عزیزو
کہ قتل مجھ کو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

فرماتے تھے ہمارا لڑکپن تھا۔ مشاعرہ میں طرح ہوئی ہمنے بھی غزل لکھی تھی۔

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ منفر جائینگے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائینگے پر جائینگے

بیگے جب بر زمیں ہم دیدۂ تر جائینگے
خشک ہیں جتنے کوئیں پانی سے سب بھر جائینگے

ابر رحمت ہے تجھے اسدم لگا دے تو جھڑی
کہتے ہیں جانے کو وہ دیکھیں تو کیونکر جائینگے

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے۔ ۳ شعر ہی یاد تھے۔

گر ورد ہے کھونا دل مضطر سے کسی کے
پانی تو پلا وار کے سر پر سے کسی کے

دل بس میں پڑا اُسکے کہ جو بس میں نہ آیا
جادو سے نہ ٹونے سے نہ منتر سے کسی کے

اللہ کرے یاں ہمیں پیوند زمیں کا +
جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

جو دل نہ کشمکشِ طرّہ دوتا میں پڑے
تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

ہَوائے سایۂ طوبےٰ نہیں ہے مستو نکو
رہینگے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے

بتو نکے ذرو نظر سے ہے دل مرا نالاں
یہ چور وہ ہیں کہ جو خانہ خدا میں پڑے

ایک کلکِ آہ بس ہے شرح غم کے واسطے
کون نیزے واسطی ڈھونڈے قلم کے واسطے

سر تو ہے تن پر مرے تیغ ستم کے واسطے
پر لگا رکھتے ہیں وہ جھوٹی قسم کے واسطے

تم بیٹھے بغل میں جو رقیب دغلی کی
کی گرم بغل ہم نے بھی گورِ بغلی کی

اے ذوق نکر نور میں آمیزشِ ظلمت
کیا کام تبرّہ کو محبّت میں علی[4] کی

مقابل اُس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

وہ[1] دل میں رکھتا ہوں میں آہِ آتشیں اے ذوق
کہ برق دیکھے تو فی النّار و السّقر ہو جائے

اسیری پر تری مرتا ہوں اے قمری لڑکپن سے
جدا تن سے ہوئی گردن تو اترا طوق گردن سے

مجھے گہوارہ بھی تھا کشتیٔ طوفاں زدہ آسا
رہا جوں طفل اشک آفت رسیدہ میں تو بچپن سے

---

(۱) چاہئے مصرعہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق

یاں لگ چکے سب دین و دل و جان ٹھکانے
کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد

اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے
آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

مرے حسن عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے
اگر انسان قانع ہو تو ہے اکسیر سے بہتر

مری توبہ پہ توبہ - توبہ استغفار کرتی ہے
ہوا و حرص لیکن اسکی مٹی خوار کرتی ہے

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں وفا کے بندے
مت بھول بندگی پر غرّہ ہیں آگے بندے

اسکو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے
زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

ہم ہونکو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے
دیکھیں تو کبتک نہیں کرتے ترے دل میں اثر

پڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے
ہم بھی نالے اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے

کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے
کیونکہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار

ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے
چار آنکھیں ہوئیں تجھ قوت بینائی سے

کونسے دن نگہ تیز نہ خونریز رہی
آتشِ عشق تو ہے گلشن جنت کی ہوا

مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی
یاں مگر آتشِ دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی

ہمکو کیا یاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے
کیا بشر مانند یوسف کیا بشر ہاروت وار

اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیر چاہ ہے

عزیزو ناقۂ لیلی کے دیکھو گئے شتر غمزے	اگر ملجائیگی مجنوں کو خدمت ساربانی کی
کہاں ہم - اور کہاں غم میکشو نکو غم سے کیا نسبت	مگر اے حضرتِ دل آپ نے یہ مہربانی کی

یہ دو شعر سب سے اخیر کا کلام ہے - اس کے بعد کچھ نہیں کہا - حافظ ویران نے کئی دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اس محاورے کو کیونکر باندھیں - پاؤں تلے کی زمیں نکل گئی - بیماری کا دوسرا یا تیسرا دن تھا - فرمایا - حافظ تم نے اس دن کیا کہا تھا : پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھے کہا لکھ لو یادداشت میں

رہے خاطر نہ بے شغل محبت کیونکہ بند اپنی	کلیدِ قفلِ دل فریاد ہے مثلِ سپند اپنی
زمیں کیا ہے ؟ فلک پاؤں کے نیچے سے نکلجائے	ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکلجائے	فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے
ستم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم	الٰہی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے

اٹھاتا عشق کی کیوں اے دلِ ناداں جو کھوں ہے	ابھی تو مال جوکھوں ہے پر آگے جان جوکھوں ہے

پیش اکرام سے ساری کرامت ہے یہی	عادت بد ترک کر تو خرقِ عادت ہے یہی

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں مال جاہ کے	طفل مکتب رہتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

لحد کو چاہیئے یوں پیر پشت خم دیکھے	سرا کو جیسے تھکا اونٹ دمبدم دیکھے

پلا مئے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری	خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

رہی اس طرح بعد از مرگ دنیا کی ہوسنا کی | شرابی کر کے توبہ جس طرح ہو جائے تریاکی

راتوں کو نہ ہو حق کر اے شیخ مناجاتی | سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

کیا ہم سخنی کرتا ہے اس گل کے دہن سے | غنچے سے یہ کہدو کہ چٹخ جائے چمن سے

قطرہ قطرہ آنسو جسکے طوفاں شدّت ہے
ٹکڑے ٹکڑے دل جو پڑا ہے تو وہ تو وہ حسرت ہے

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بت گمراہ بھی چاہے | ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

کل کے جو وصل کے عالم ہیں نظریں پھرتے | آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ہم اور غیر یکجا دونو بہم نہ ہونگے | ہم ہونگے وہ نہ ہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

جنوں کے دست مبارک ہیں پیرہن کو لگے | رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

لاشہ کو دفن کیجے میرے کہ پھینکدیجے | مردہ بدست زندہ جو چاہئے سو کیجے

معلوم ہوا بینی و ابروئے بتاں سے | اک تیر ہے گویا۔ کہ چڑھا ہے وہ کماں سے

ڈسا ہو کالے نے جسکو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ مُنہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمّید ہے
نااُمیدی سے مگر آرام کی اُمّید ہے

اگر اُٹھّے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے
لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی
کالا کریگا مُنہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

عیاں ہے اشک کی گرمی ہویدا سوزشِ دل ہے
کہ آتا اپنا اشکِ سوختہ مانندِ فلفل ہے

دردِ دل سے لوٹتا ہوں میرا اسکو درد ہے
بین معنٰی لفظِ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

دل گرفتار ہؤا یار کی عیاری سے
ہم گرفتار ہوئے دل کی گرفتاری سے

جو کہو گے تم۔کہینگے ہم بھی ہاں یونہی سہی
آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

جس در پر یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقل سحر اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

رازِ درونِ خم سے کسے اس پردہ میں آگاہی ہے
یوں تو ہر ایک زعم میں اپنے افلاطون الٰہی ہے

وہ لعل شیریں کسی کے دل کی الہٰی کیا ہو گیا دوا ہے؟
کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو رہا ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے۔ | خاک میں جب مل گئے دونو برابر ہو گئے

اب ہے جا زیر مغیلاں ترے دیوانوں کی | مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے | یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے | بہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے

کوئی جو اُسکو پڑھکر عاشق کا خط سُنائے | اک حرف مدعا پر سو بے نقط سُنائے

لاشے کے ساتھ بھی نہ مری قبر تک چلے | ہوتے ہی اذن عام کے گھر کو کھسک چلے

نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے اک دم ٹھہرتی ہے | ترے بیمار غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

ناخنِ سے منقار کی میرے داغ جنوں کو زاغ کھجائے
عشق یہ تیری فطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

چاہئے زر اِن بتانِ سیم تن کیواسطے | یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کیواسطے

پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے | ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی	ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی
مصروف چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے	مرچیں سی لگ رہی ہیں زخم جگر کو میرے
مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی	[illegible] کہ بھی مراد محبت میں مل گئی
بدنہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے	ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے
لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے	میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے
کیا تاب دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے	دوزخ بھی ہو تو اُن کی چلموں پہ آگ رکھے
کرے کعبہ میں کیا جو سر بتخانہ سے آگہ ہے	یہاں تو کوئی صورت بھی وہاں اللہ ہی اللہ ہے
ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے	بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پائے مردی سے
جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے	کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے
خاک اڑاتا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے	پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے
جہاں دنیا میں دیکھا سچ کے اوپر جھوٹ فائق ہے	کہ پہلے صبح کاذب ہے تو پیچھے صبح صادق ہے

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سُن سُن اپنے | کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن[لہ] اپنے

بیمار۔غم جو اُس کا کھا کر زمین دیکھے | خوش خوش وہ مقبروں کی جا کر زمین دیکھے

کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے | ملتی اسپر کفِ افسوس ہے مقراض کہ ہائے

وحشت اگر پتنگ کو ہوویگی داغ سے | زنجیر گھڑ کے ڈالینگے دودِ چراغ سے

تری عمرِ دو روزہ غافل ایک پتلی ہے دو کل کی | کہ اک کل روزِ آخر کی ہے اک کل روزِ اول کی

دکھانے کو نہیں ہم مضطرب حالت ہی ایسی ہے | مثل ہے رو رہے ہو کیوں۔کہا صورت ہی ایسی ہے

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی | پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی۔

جو تیرے ناخن پا تیرا مائل دھو کے پی جاوے | تو اُسکے دست و پا پھر ماہ کا مل دھو کے پی جاوے

جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے | یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

لہ۔کتب تصوف میں لکھا ہے کہ جب انسان کو بہت ہنسی آئے۔تو ناخنوں کو دیکھنے لگے ہنسی تھم جائیگی۔ سبب اس کا یہ لکھا ہے۔کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے نکلے تھے تو ان کا جسم مبارک ایسا صاف اور روشن تھا۔جیسے ناخن۔دنیا میں آکر بدلنا شروع ہوا۔اور اولاد کا رنگ بدلتے بدلتے ایسا ہو گیا کہ ظاہر ہے۔جب انسان ناخنوں کو دیکھتا ہے۔تو روحانی آگاہی سے دل مُشبہ ہوتا ہے اور افسوس میں ہنسی جاتی رہتی ہے۔ ۱۲۔استاد رحمۃ اللہ علیہ

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے | تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی اِدھر | سو بھی آکر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

اس شعر پر خاتمہ اُن کا اور اُن کی شاعری کا ہوگیا +

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا | کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

۱۸۳۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی نام ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں مرگیا۔ حسین بھی تھا۔ اور بادشاہ کو بھی اُس سے بہت محبت تھی۔ رنج ہوا۔ اور ایسا ہوا کہ کئی ہفتے تک شعروں میں ٹپکتا رہا۔ انہی دنوں میں استاد مرحوم ایک دن قلعہ سے پھرتے ہوئے والد مرحوم کے پاس آئے۔ مجھے یاد ہے اوّل بادشاہ کے ملالِ طبع کا حال بیان کیا۔ پھر ایک مطلع سنایا۔ کہ اُسی وقت غزل درست کر کے آئے تھے۔

گُل کچھ تو اُس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے | وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کمُلا کے جھڑ پڑے

پھر کہا ردیف مناسب مقام نہیں۔ اور ذرا سوچ کر آپ مطلع پڑھا۔ اور خود کتاب یادداشت میں لکھ دیا۔

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے | حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یا اللہ۔ کیا وقت تھے۔ اور کیا کیا موقع پیش آتے تھے۔ پھر فرمایا۔ حضور کا ایک قطعہ بھی ابھی درست کر کے آیا ہوں۔

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسب حال | دیکھے تماشے میں نے جو مُلکِ وجود کے
اک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے | پھر یہ ہوا گذرنے لگی کھیل کود کے

اب حال یہ ہے عالم پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے۔ فرمایا قلعہ سے آتا ہوں۔ مرزا شاہرخ[۱] آج کہنے لگے بھئی اُستاد۔ میں نے مولوی صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سُنایا تھا۔ اُنھوں نے کہا "شنود۔ نہیں۔ شنید چاہئے"۔ اسی وقت مجھے شعر یاد آیا۔ میں نے کہا۔ مولوی صاحب سے تعجب ہے کہ ایسا کہا ہو ؎

گر عشق نبودے و غم عشق نبودے	چندیں سخن نغز کہ گفتے و شنودے

مطلع مرقومۃ الذیل میں خدا جانے بادشاہ کو کیا پسند آگیا تھا۔ اُستاد فرماتے تھے کئی دفعہ حضور نے اس کے مضمون کو ہیر پھیر کر کے لینا چاہا۔ ہم نے ہر دفعہ اپنے مطلع کا پہلو بچادیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ استاد نے ایسا کیا۔ ورنہ اُن کا یہ طریقہ نہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ سبب بھی پوچھا۔ فرمایا خدا جانے جب ہُوا کچھ ایسا ہی خیال ہو گیا۔

کیا کہوں اُس ابروئے پیوستہ کے دل بس میں ہے	ایک طعمہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالم شباب تھا۔ ایک بزرگ کہن سال نے کسی پرانے شاعر کا مطلع سُنایا ؏

آبلے دکھلائے جب۔ اس دل رنجور نے	دانتوں میں تنکا لیا۔ خوشۂ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اُسی وقت یہ مطلع ہوا۔

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے	خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

اُس زمانہ کے لوگ بڑے باانصاف ہوتے تھے۔ سنکر بہت تعریف کی۔

قطعہ

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر	کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر	مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم	اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

[۱] مرزا شاہرخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہد وقت سے چھوٹے تھے۔ وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے۔

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں ہیں اور کہاں یہ شب۔ مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے

سوا اس ظلمت کے پردہ میں کئے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مری سینہ زنی کا شور سُن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بیتابی و بے طاقتی نے

کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سورہ
بہت الماس کے توڑے نگینے

نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جانکنی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوعِ صبح سے مُنہ روشنی نے

کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے

لگے پانی چُوانے منہ میں آنسو
پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی
اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اُکھڑ کے اُدھر سے اِدھر ہُوا پیوست

گذرتی ہوگی بآرام زندگی تیری
کہ تجھکو اب غمِ نیست ہے نہ شادیٔ ہست

کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انساں
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست

اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ بافراغ کرے کنجِ عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں
گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر
جو سنگاہ تصرف میں بھی ہوئی اُس کو
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ

تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہُوا پابست
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست
تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالا دست
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجے شکست
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
گیا زباں سے نکل اُسکی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہ ز ہمہ - باخدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم
آخرش ہوگا وہی اکدن خزاں کے ہاتھ سے
ہے غنیمت کوئی دم نظارہ رنگ بہار
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت

شل نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
جو کہ عالم اپنا اس نشو ونما سے پہلے تھا
پھر کہاں یہ گلشن اور گل - اور سبزہ یہ ہَوا
ایں تماشائے جہاں رامفت مے بینیم ما

رباعیات

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہُوا - ہُوا کرم سے تیرے

ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوگا تِرے کرم سے ہوگا

اعلیٰ جو علیؓ کی ہے امامت کا مقام
جو لوگ صفِ اوّل میثاق میں تھے

رکھتے ہیں خبر اُس سے یہاں خاص نہ عام
پُوچھے کوئی اُن سے کہ وہ کیا تھا امام

سبطینِ نبیؐ یعنی حسنؓ اور حسینؓ
زہراؓ و علیؑ کے دونو وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لئے
اے ذوق لگا آنکھوں سے ان کے نعلین

دل کو سرِ بازارِ جہاں کر نہ اُچاٹ
جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ حصے
سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے
سب کہتے تھے اُن کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون۔ ایسے تیسے

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہُوا
ایک دم نہ تیرا صرفِ مناجات ہُوا
جب تک تھا جوان تھا جوان بدمست
اب پیر ہُوا۔ پیرِ خرابات ہُوا

آنکھ اُس کی نشہ میں جب گلابی ہو جائے
صوفی اسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ روئے کتابی اے ذوق
سب مدرسہ کافر کتابی ہو جائے

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھِل کھِل
اب درد سے ہیں وہی رلاتے ہِل ہِل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے
اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کِل کِل

اے ذوق فرشتے ہیں یہ کہکر روتے
اے کاش کہ انساں ہی ہم بھی ہوتے
غفلت میں یہ رہتا ہے یہاں تک ہشیار
شیطان کے چلا دیتا ہے سوتے سوتے

ان آنکھوں سے رُوئے لالہ گوں بھی دیکھا
اور پھر ان کو پُر اشکِ خون بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوق
یوں بھی دیکھا جہاں میں وُوں بھی دیکھا

دنیا کے الم ذوق اٹھا جائینگے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائینگے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
اب جائینگے اوروں کو رُلا جائینگے

دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت وسیاہ
وہ لطف سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بداصل کو کیا نامِ خدا کوئی بتائے
بندوق کا طوطہ نہ کہے حق اللہ

اِس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانینگے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا
اس وحشی رم دیدہ کو کیسا رمنا
ہم پے رو عشق و عشق اپنا ہادی
جو عشق کہے ذوق کہو سلمنا

کھلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں
ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں
کہئے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے
کل حزب بما لدیھم فرحون

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑ کروں میں
غصہ سے کروں کس لئے دل کو خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے؟
تم ہو تم ہو۔ جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

رباعی مرقومہ حاشیہ میں نے ایک دن اُستاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے۔ فرمایا۔ کاٹ دو۔ میں نے کہا مضموں تو بہت خوب ہے۔ فرمایا۔ رباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں۔

دنیا سے ذوق رشتۂ اُلفت کو توڑ دے | جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑیگا اس پیرہ زال کو | یہ پیرہ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جنکو اسوقت میں اسلام کا دعوےٰ ہے کمال | غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر | نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق | ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے | کیوں بُرا کہنے سے تو اس کے بُرا مانتا ہے

قدم سنبھال کے رکھ راہ عشق میں اے ذوق | گذرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلہ پائے مور بھی ہے یہاں | ترے ڈبونے کو وہ بھی تنور طوفاں ہے

نذر دیں نفس کس کو دنیا دار | واہ کیا تیری کارسازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق | مال موذی نصیب غازی ہے

لہ۔ رباعی مرقومہ ذیل دیوان مروج و مطبوع میں مؤلفوں کی بے خبری سے درج ہوگئی تھی۔ الحمدللہ کہ جو اس میں اصلاح ہوئی۔ بندہ آزاد کو یاد تھی۔ ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کیا ترک | دنیا ہے بری بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا | جب تک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک

دل سے ہیں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام
ہیں حضوری ہیں رہوں اسکی نہ کسطرح مدام

دل کھو۔ جان کھو جانیں ہیں اس بات کو سب
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازع تھا۔ اُستاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کروادی۔ اور اس قطعہ سے اس کی بھی دلجوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھکو ملامت تو نہ کر
بسکہ مجھکو عشقبازی کا ہے ذوق

کس طرح میں عشق سے بیزار ہوں
کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا لکھکر۔ زرنگار کاغذ پر لکھکر۔ ایک سونے کی کشتی میں رکھکر بڑے تکلّف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔

خوش ہو اَے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہ کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا؟

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرہ کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع کو دیکھکر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہؤا۔ اُستاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور رہیں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے تو دیکھو! انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا۔ کہ ابھی لکھدو۔ اور کہا۔ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی۔ حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا+

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ۔ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تابنے اور بُنی میں لئے اخلاص بہم
گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

ایک گُہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اِتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طُرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشیدِ فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ نارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثناگر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور ہیں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنہیں ملا۔ اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے ادا شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور۔ ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ لکھکر حضور میں گذرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشا کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مُدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مثنوی

نواب حامد علیخان مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک شوقیہ خط کی استاد مرحوم سے فرمایش کی بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں۔

مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں رمضان آگیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دئے۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی - اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا - انہوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کر دیا - اور کئی دن میں ۴۰۰ شعر ہو گئے - لیکن ادھر رمضان ہو چکا - ادھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کر دیں مثنوی وہیں رہ گئی - بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اُٹھی مگر ایک دن کبھی دو دن - ۲۰ - ۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئے -

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا - تو اکثر اس کا ذکر کیا کرتے۔ اور کہیں کہیں کے شعر بھی پڑھا کرتے میرے بار بار کہنے سے اُسے نکالا تو دیکھا کہ ۳ تختیاں مشقِ اطفال کی تھیں - دونو طرف سے سیاہ تھیں - اور کچھ کاغذی مسوّدے تھے - تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی نہ جاتی تھیں - فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچکر بتاتے گئے - میں لکھتا گیا - ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے - نامہ ناتمام تھا۔ مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا - میرے صاف کئے ہوئے جُزبھی اُنہی غزلوں میں تھے - جو میں خلیفہ صاحب کے ہاں جاکر صاف کیا کرتا تھا - سب کے ساتھ وہ بھی گئے - اس کا نام نامۂ جانسوز تھا - اول حمد و نعت تھی - پھر ساقی نامہ - پھر القاب معشوق - اسی میں اس کا سراپا - اس کے بعد یادِ ایامِ وصل - اس میں چاروں موسموں کی بہار - معنوں کی نزاکت - لفظوں کی لطافت - ترکیبوں کی خوبیاں - اندازوں کی شوخیاں - کیا کہوں - سامری کا جادو اس کے آگے دھواں ہو کر اُڑتا تھا - چند متفرق شعر دیوان مطبوعہ میں ہیں چند شعر مجھے یاد تھے - یکجا لکھ دیتا ہوں کہ جو یادگار رہ جاوے وہی غنیمت ہے -

مثنوی

چاہئے نام اُسی کا اے خامہ	زینتِ نامہ زیبِ سرنامہ

ہے فلک اک نمونہ قدرت کا
یا قلمداں ہزار صنعت کا

رُخِ قرطاس کو صفائی دی
اور سیاہی کو روشنائی دی

دیا قمری کو مصرعِ نالا
مصرعِ قدِ سرو پر بالا

کی عطا نو خطوں کو کلکِ ادا
کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا

نمک افشاں ہے عشقِ شور انگیز
زخمِ دل کرتے ہیں بریز بریز

عکس ہے سبزۂ لبِ جو کا
وسمہ قوسِ قزح کے ابرو کا

آئے گلشن میں فصلِ گل سو بار
بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار

ساقیا جلد اُٹھ و درنگ نہ کر
عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر

طاق سے تو اُتار لے شیشہ
طاق پر رکھ کتابِ اندیشہ

شیشۂ مے کی یہ دراز زبان
اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں

میں ہوں مانندِ ساغرِ لبریز
جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز

جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے
پانو توبہ کے لڑکھڑانے لگے

ق

کر دے یاں تک مجھے نشہ میں چور
تاکہ مانندِ خوشۂ انگور

دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں
نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی +

بسترِ رنج و کنجِ تنہائی
رات کیا آئی اک بلا آئی

شام سے حال ہے یہ صبح تلک
نہیں لگتی مری پلک سے پلک

کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور
کیا شفق نے کھلا دیا سیندور

گر لکھوں خط میں بیقراریٔ دل
نامہ بر ہو کبوترِ بسمل +

مضطرب اب جو ہو رہا دل ہے
دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے

دل کی واشد کی کیا کروں تدبیر
غنچۂ دل ہے غنچۂ تصویر

جانِ بیتاب جیسی بیکل برق
وہ بھی گرمِ رہِ فنا کالبرق

نبضیں چھوٹی ہوئیں غشی طاری
دل سے رخصت ہے تاب طاقت کی
ہوس سیر باغ ہے کس کو
کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر
اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت
ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر
ماہِ بے مہر بلکہ دشمنِ مہر
برق کا وہ ذرا چمک جانا
فتنۂ استاد نرگس فتاں
رُخ تعالیٰ و زلف صلِّ علےٰ
زُلفِ جنباں میں رُخ کی بَرّاقی
گو انا ربکم نہ منہ سے کہے
مچھلی بازو کی یا ہے ذو الفین
کمر و ناف از پئے دلِ زار

(۱) زلف و رخسار دو صورت خط

ایک فرقت ہزار بیماری
بیقراری نے استقامت کی۔
دل ہے کس کو دماغ ہے کس کو
سگِ دیوانہ بن گیا ہے گھر
تن بتقدیرِ سنگ آمد و سخت
رہو یں دریا میں اور مگر سے بیر
ہر ستم میں ستم شریکِ سپہر
اور بغل میں ترا دباب جانا
گردِ مژگاں ہجومِ شاگرداں
قد وہ سُبحان ربی الاعلےٰ
کرے مشائیوں کو اشراقی
لیک جاری زبان ہر مو سے
غرقہ کش بحرِ خوں سے مردمِ عین
رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

رنگِ پان لعل روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر

قصیدہ نمبر (۱)

نظر ثانی سے نور نہیں پایا - اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے -

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ - تھا میں بیٹھا - نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ - حور طلعت - بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت - چمن کی رنگت - گر اس کا شیوہ - تو اُس کا جلوہ
زبان شیریں - بیان رنگیں - کلامِ رنداں - خرامِ مستاں
انیس خلوۃ - جلیس جلوۃ - حریفِ حکمت - ظریفِ صحبت
بہ بزم یاراں - بدلِ بہاراں - باہل عزلت - گلے بداماں
حسیں بشکل و مہ منور - عرق کے قطرے ہیں اُس میں اختر
ہلال ابرو - نگاہ جادو - خدنگ مژگان و چشم فتاں
بروئے رنگیں - نگار بستاں - شگوفہ خنداں - گرہ خنداں
بموئے پیچاں - ہے عشق پیچاں - جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب کج کلاہی - جو دیکھو بینی تو یا الٰہی
دہن میں غنچہ - لبوں میں گلبرگ و - روئے روشن میں مہر تاباں
نگاہ ساغر کش تماشا - بیاضِ گردن - صراحی آسا
وہ گول بازو - وہ گوری ساعد - وہ پنجہ رنگیں بخونِ مرجاں
کمر نزاکت سے لچکی جائے - کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اُسپہ سو نور لہر کھائے - پھر اُسپہ ہیں دو قمر فروزاں
وہ ران روشن - وہ ساق سیمیں - وہ پائے نازک - حنا میں رنگیں
وہ قد قیامت - وہ فتنہ قامت - دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا - کہا خوشی ہوں - جو وصف پوچھا - تو دلبری ہوں

سبب جو پوچھا تو ہنسکے بولا - کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں
وہ شاہ جو ہے - محمد اکبر - جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوسِ جشن اس کا ہے فلک پر - اُسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں
یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت - لکھا وہ مطلع شفق شباہت
کہ جس کو احسن کہے سخنور - پڑھے بہ تحسیں ہر اک سخنداں

مطلع

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں - ہے چتر بن بن کے ہوتا قرباں
کہ ہفت اختر بہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیع فرماں +
وہ ہے ترا اختر ہمایوں - کہ ہو کے روشن چراغ گردوں
مدام کانپے ہے شعلہ آسا - بزیرِ فانوس چرخِ گرداں
سحاب ہمت جو درفشانی - کرے بہنگامِ حکمرانی +
تو ہو خجالت سے پانی پانی - ہوا پہ یکدست ابرِ نیساں
تری عدالت میں ہے یہ قدغن - کتاں کو دیکھے نہ ماہِ روشن
وگرنہ ہالہ ہو طوقِ گردن - کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں
جو تیغ بُرّاں کو اپنی شاہا - کرے علم تو بروزِ ہیجا
تو زیرِ داماں ابر اپنا - دکھلائے جلوہ نہ برقِ رخشاں
یہ تیرا خنجر ہے یا کہ شہپر - کہ جس کے لگتے ہی دم میں اُڑ کر
قفس سے ہوتا ہے تن کے پرّاں - ترے مخالف کا طائرِ جاں
ہے عیدِ قرباں میں تیری میموں - رکھا بزرگوں نے شتر گردوں
کہ کھا کے گاو زمیں نہ ہیبت - کہیں بزیرِ زمیں ہو لرزاں
رکھے گا فغفور چینی خانہ - تو حکم دے اے شہِ زمانہ
بنا صفاہاں پہ آستانہ - کہ سمجھے دارا بجائے درباں

تری سخاوت کا سُن کے عالم - اُمنڈ پڑا ہے تمام عالم
عرب سے آیا ہے چل کے حاتم - بلب سوال و بدست داماں
جو آئیں جنبش میں لعل شیریں - چمک ہو اُن کی کلام رنگیں
تو حکم دیوے تو ہو ویں آئیں - تو ہنس کے بولے تو گل ہو خنداں
جو ہو سوارِ سمندِ تازی - کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دورِ فلک کو بازی - بپائے گوئے و بدست چوگاں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
وہ تیرا ہے فیلِ کوہ پیکر - کہ جس پہ کہتے ہیں سب نظر کر
فلک پہ دُمدار ہیں دو اختر - وہ یا نمایاں ہیں اس کے دنداں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
ترا جو وصفِ خجستہ شاہا لکھے - قلم کو کہاں ہے یارا
ثنا دعا پر ہے ختم کرتا - جو ذوق تیرا ہے تہنیت خواں
کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں - حسود ہوں سرنگون و محزوں
بہ جشن ہو فرّخ و ہمایوں - سدا بصد فرّ و شوکت و شاں

قصیدہ نمبر ۲

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے - افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا - ورنہ عجب جلوہ دکھاتا - اکثر شعر اس کے زبانی ثنا کرتے تھے - دل روشن ہو جاتے تھے - کئی شعر مسودۂ موجودہ میں نہ تھے - بندہ آزاد کو اُن کی زبانی سُنے ہوئے یاد تھے - وہ بھی درج کئے ہیں -

صبح سعادت نورِ ارادت تن بریاضت دل بہ تمنّا
جلوۂ قدرت عالمِ وحدت چشم بصیرت محوِ تماشا

قصرِ رفیع وصحنِ وسیع طرزِ مسجع سطحِ مربع
باغ ارم یا روضہ رضواں خلدِ بریں یا جنّتِ ماوٰے
مرغ خوش الحاں بر سرِ بستاں ہر گلِ بستاں خورم وخنداں
گوش شقایق - محوِ سرود و دیدۂ نرگس مستِ تمنّا
لحن قماری شکلِ مسبّح صوت عنادل وردِ مہلّل
سرو بقامت نخل دعاؤ نکہتِ گل یا دم بہ مسیحا
فصلِ ربیع و موسمِ اُردی معتدل اک جا گرمی سردی
میلِ عناصر سوئے طبائع ربطِ قوٰے با عالمِ اشیاء
چہرہ گلشن آتش رخشاں سرخی گل ہیں لعل بدخشاں
سبزہ بہ شبنم رشکِ جواہر لالہ بہ ژالہ لولوئے لالا +
قلب کو فرحت روح کو راحت عقل کو قوت طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمہ مطرب نالہ بہ چنگ و نشہ بہ صہبا +
خندۂ گل پر نشاءُ مُل پر سروِ چمن پر لطف سخن پر
نغمۂ بلبل نالہ صُلصُل قہقہۂ قُلقُل بر لبِ مینا
نُلغُلہ اندر محفلِ مستاں وجد ہیں خیلِ بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں باربد آسا چنگ نوازاں شکلِ نگینا
جامِ بلوریں با مئے لعلیں صبح بہار و گلشن رنگیں
پنبۂ مینا بر سرِ مینا اخترِ صبح و گنبدِ خضرا
ساقی مہوش مست شبانہ مطربِ دلکش صرف ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسّم وقت سعید انوار سراپا
ایک بت ترسا - با دل سنگیں - لعبتِ کافر باہمہ تمکیں
صورت لات و شکلِ منات و رشکِ یعوق و غیرت عزّے

کانِ ملاحت بحرِ صباحت جوئے فصاحت گلشنِ راحت
شور میں لیلیٰ نور میں سلمیٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لبِ میگوں عارضِ گلگوں وہ قدِ موزوں چشمِ پر افسوں
برگِ گلِ تر لالہ احمر سرو صنوبر نرگسِ شہلا
خال بلب ہے۔ نقطۂ مشکیں۔ یا ہے ہلال و چشمۂ شیریں
مردمِ دیدہ محو بدیدہ لالہ بہ داغ و دل بہ سویدا
فوج نظارہ جوں رمِ آہو۔ آہوئے کعبہ نرگسِ جادو
چیں بہ جبیں محراب بہ کعبہ۔ طاق دو ابرو مسجدِ اقصےٰ
چاہِ زنخداں آبِ زلال۔ اور اسپہ تکلّم چشمۂ شیریں
ناصیہ روشن جوں کفِ موسےٰ زلفِ شکن در خطِ چلیپا
پان کی سرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوسِ قزح سے
دام برائے گردنِ عنقا چشم و چراغ دیدۂ حورا
بیت زلالی لب بہ تکلّم۔ فردِ خیالی رنگِ تبسّم
موئے میاں جوں معنیٔ نازک تنگ دہاں سربستہ معمّا
عارضِ گلگوں چشمِ پُر افسوں سبزۂ تر سے طرزِ نظر سے
مایۂ نازو۔ غمزہ طرازو۔ گلشنِ رازو۔ راز بدلہا
فتنہ سراپا۔ قہر سراسر۔ سست وفا میں چست جفا میں
شرم سے ڈوبا بحرِ حیا میں۔ ناصیہ رو بر عالمِ بالا
رمز سے ہو کر صرفِ تکلّم۔ ناز سے ہو کر لب بہ تبسّم
مجھ سے کہا ہو زمزمہ پیرا۔ تو بھی تو بول اے بلبلِ شیدا
میں نے پڑھا ایک مطلع روشن مدح میں تیرے جس سے ہو گلشن
روحِ معزّیٔ اے شہِ عالم۔ غش ہو جریر اور شاد ہو اعشےٰ

اے شہ عالم در ہمہ عالم - عالیِ اعلےٰ - والی والا
لب بہ ستائش - دل بہ نیائش جلوہ طراز عرش معلّےٰ
نفس خلافت از رہ رتبت تختِ خلافت عرش بہ عظمت
تو ہے بہ حکم وجہ جو صورت وہ ہے بہ نفس رتبہ ہیولےٰ
روح مجسم عقلِ مکرّم نفس مقدس جسمِ مطہر
باتن صافی جان موافی پردہ بہ دنیا جلوہ بہ عقبےٰ
علمِ حقیقی علمِ مجازی تیرے حلول ساری و طاری
اصل مبانی نقلِ معانی عقل کو تیرے عیشِ مہیّا
سارے پڑھے اسماے الٰہی سب ہیں موثر اے شہِ اکبر
اسم جو اعظم ہے تو وہی ہے جس سے ہے تیرا اسم مسمّےٰ
فہم ہیں لے کر صافی طینت رکھ کے نظر ہیں اوج قرینت
غرق حیا ہیں زمزم و کوثر سر بہ زمیں ہیں سدرہ و طوبےٰ
خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقاؤ خاک شفاؤ نار خلیل و باد مسیحا +
تو سر دنیا ظلِ الٰہی حکم ترا تا ماہ بہ ماہی
تخت ترا ہے تا بہ ثرے - اور فوق ہے تیرا تا بہ ثریّا
حکم پہ حاضر نظم پہ ناظر - تیرے جلوسِ جشن کی خاطر
فوجِ سکندر لشکرِ دارا - تختِ فریدوں مسند کسرےٰ
تجھ سے ہی قائم شام و سحر ہے - تجھ سے ہی دائم تازہ و تر ہے
بارِ مراد و برگِ نشاط و - شاخ امید و نخل تمنّا
تو بہ ریاست تو بہ فراست - تو بہ متانت تو بہ سیاست
فطرت لحیاں فکرِ جماعت حسن بیاض و غصّہ حمرا

رو برضا و لب بہ دعاؤ دست بہمت پا بہ اقامت
لب بہدایت دل بہ درایت صرف بہ زہد و محو بہ تقویٰ
تو بہ حقیقت تو بہ طریقت تو بہ شریعت تو بہ ودیعت
پاک سرشت و نیک نوشت و جسم مطہّر قلب مصفّےٰ
رو بہ تجمّل خو بہ تحمّل کف بہ تکلّف لب بہ تکلّم
روکش یوسف ہمسر صالح ہمرہ موسےٰ ہمدم عیسیٰ
تیری محافظ آیۂ کرسی - تیری معاون آیتِ قدسی
زیب تمایم سورۂ یاسین حرز عزائم سورۂ طٰہٰ
جانب اعدا تو سرِ میداں کھینچ لے جدم صارم برّاں
نعرہ ہو اس کا اُقتلُ اِقتل - ندیہ اس کا نحن قتلنا
جلوہ سے تیرے ہو نہ منوّر شام و سحر آفاق تو کیونکر
مہ ہو دوائے دیدۂ شپّر مہر ضیائے حیرتِ حربا
تو دمِ فرحت تو دمِ عشرت تو دمِ صولت بر سرِ دولت
ماہ بسرطاں زہرہ بمیزاں تیر بہ قوس و شمس بہ جوزا
فہم ترا وہ عقل ارسطو بالغہ جس سے جوہر ثانی
عقل ترا دے درس فلاطوں فلسفہ جس کی ابجد اولےٰ
حال دو عالم تجھ میں ہے پیدا - اور ہے یہ نور کشف ہویدا
غیر قیافہ غیر سرہ وہ - غیر تفاؤل غیر بہ رویا
تیری شمیمِ خلق سے طاری - تیری نسیمِ طبع سے جاری
باد بہاری مشک تتاری - عود قماری - عنبر سارا
فکر فرنگ و دانش یوناں آگے ترے ہے طفلِ دبستاں
تو ہے وہ باہر - تو ہے وہ ماہر - تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا

تیغ سے تیری پیکرِ دشمن - حلقہ بہ حلقہ جب ہو بہ جوشن
پیشِ حکیماں کب رہے ثابت - عقل سے جزو لایتجزیٰ
زینتِ لوح شوکت و شاں تو زیبِ سرِ توقیع جہاں تو
اسپہ مزیّن جوں گل طغرے - اسپہ مسجّل جوں خطِ امضا
حاتمِ دوراں منذرِ نعماں رستمِ دستاں شیرِ نیستاں
تو بہ سخاوت تو بہ عنایت تو دمِ جرأت تو سرِ ہیجا
حسن ادائیں نکتہ موزوں - طرزِ بجائیں - گوہرِ مکنوں
شغل و عمل میں نظمِ مسجّع - حرفِ سخن میں نثرِ مقفّٰی
تیرا ہے توسن سایہ ذوالمنن - برسرِ جستن در دمِ رفتن
برقِ جہان و آب روان و شعلہ آتش موجۂ دریا
باد بوقت تیز روانی ابر بوقت قطرہ فشانی
جب تو اڑا دے کوہ وجبل پر جب تو رواں ہو جانبِ صحرا
(یہاں سے دو شعر رہ گئے)
فیل ہے تیرا ابرِ بہاراں - پر بہ خیال بادہ گساراں
ہووے درخشاں برق بہ باراں دے جو ہلا زنجیرِ مطلّا
بحر بوسعت کوہ برفعت - پردہ کوہِ نور بہ ظلمت
اسپہ طلوعِ جلوۂ طلعت - طور پہ گویا نورِ تجلّٰی
پشت پہ اس کی ہودجِ زرّیں قوسِ قزح سے مشک رنگیں
تیرا طلوع اے خسروِ خاور صبحِ شفق میں کردے ہویدا
تھا جو سخن آغازِ ثنا سے ختم سخن ہو حسنِ ادا سے
ذوقِ سخنداں تیری دعا سے طرزِ سخن موزوں ہو سراپا
دل ہے ترا با نور کا عالم بلکہ فروغ طور کا عالم

پیش نظر ہے دور کا عالم سن تو سہی افلاک پہ ہے کیا
وردِ ملایک نام خدا ہے دیکھ زباں پر کس کی ثنا ہے
دل کہ سراپا دستِ دعا ہے ۔ دست دعا و دامن شبہا
تاکہ زماں منضم بہ زمیں ہو ۔ دور میں چتر چرخ بریں ہو
شاہ کا عالم زیر نگیں ہو ۔ سطح زمیں ہو عالم بالا

قصیدہ نمبر ۳

اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے ۔ افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا ۔ آغاز جوانی کا کلام ہے

خضرِ نصیب کی گر ۔ دنیا میں رہبری ہو
اور شاہ راہ دلبر ۔ چشم ہنروری ہو
منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں
روشن قلم سے میرے تاج سکندری ہو
تارہ کی طرح چمکے ذرہ میرے سخن کا
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو
میں رستمِ معانی ۔ اور سیستاں سخن ہے
دیتا جو زور قسمت دل کو تناوری ہو
برگشتہ بخت اپنا ۔ گر آئے راستی پر
گردوں بھی سرنگوں پھر دیکھ اپنی سروری ہو
یہ کہ رہا تھا میں جو ۔ یکبار عقل بولی
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی لبری ہو
تجھکو خبر نہیں کیا ہے دور شاہِ اکبر
رفعت سے پست جس کی شانِ سکندری ہو
ہے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں
اور دل کا اُس کے مقصد خود بندہ پروری ہو
مثلِ سحاب جا کر باندھے ہوا فلک پر
جس پر کہ اُس کی چشمِ الطاف سرسری ہو
دربار میں تو اُسکے ۔ ہو بہرہ یاب جا کر
بہروزی ہووے میری اور تیری بہتری ہو
لیکن رہِ رسائی اُس وقت ہو گی روشن
جب خضرِ راہ تیری ۔ طبعِ سخنوری ہو
تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا
اُسکے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو
اُس کی نظر چڑھیں گر یہ تابدار گوہر
پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو
تب بحرِ فکر میں دل غوّاص ہو کے اُترا
معلوم تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار بن کے موتی — شرمندہ جس کے آگے صدکانِ جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جس ذرہ پر ذری ہو
وہ آسماں پہ جاکر خورشیدِ خاوری ہو

دیکھی ہے چین ابرو آئینہ جبیں میں — کیونکر نہ تن میں اُسکے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے — گر ہر پائے بندی ایماء سرسری ہو
یہ آستان دولت ہے سجدہ گاہ عالم — دل کو تری عقیدت اور نگ سروری ہو
دارا کو تیرے درتک ہو کس طرح رسائیؔ — درباں جو تیرے در کا کرتا سکندری ہو
سورج مکھی کا تیرے اک پھول مہرانور — قربان چتر دولت۔ نہ چرخ چنبری ہو
باغِ جہاں میں نرگس۔ لے کیوں نہ جام زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغرِ زری ہو
دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو
کشتِ امل کو سرسبز آب گہر سے کردے — ابرکرم کی تیری جب فیض گستری ہو
بیشہ میں معدلت کے۔ وہ شیر ہے تو شاہا — نوشیرواں کو جس سے۔ ہرگز نہ ہمسری ہو
شبو ہوسوں کا۔ مہر کرم میں تیرے — تیری گداگری ہو۔ کیوں کیمیا گری ہو
گر آفتاب تیرا۔ ڈالے کرن کو اپنی — تاجِ گدا کا جلوہ۔ جوں تاجِ قیصری ہو
تیری ثنا میں شاہا۔ لکھنا ہو اب وہ مطلع — جس کی چمک سے کاغذ چمن کا غذزری ہو

پابوس نقشِ پا سے۔ تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پر اُس کو تاروں سے برتری ہو

ابرِ کرم سے تیرے۔ کیا دور ہے کہ شاہا — کشتِ فلک میں پیدا۔ سرسبزی و تری ہو
سورج کی جو کرن ہے۔ گردوں سے لے زمیں تک — مانندِ عشق پیچاں پھر سر بسر ہری ہو
مریخ کو فلک پر۔ جس تیغ سے ہو ہیبت — دشمن کو بھاگ کر پھر کیا اُس سے جانبری ہو
نعرہ سے تیرے ہو وے۔ ہیبت کا چاک سینہ — دل پر دلاوری کے وہ تیغ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں۔ کون آج ہے توانا — جو دل کے ناتواں کو دیتا تونگری ہو

جاروب کش ہے تیرے مشکوئے خسروی کا
زیبا ہے ماہ کو گر۔ فرمانِ مشتری ہو

خورشید نذر لائے۔ جب افسر شعاع سے
منشور افسری پر توقیع خاوری ہو

ابر و تمہے تاج بخشی جسدم کرے اشارت
کشتی میں لے کے حاضر ہو افسر زری ہو

لائیں پئے سواری۔ توسن کو جب سجا کر
صورت میں ہو وے پتلی۔ پرواز میں پری ہو

چلتا ہوا ہے افسوں اڑتا ہوا چھلاوہ
پھر اس سے آگے بڑھکر کیا سحر سامری ہو

کیا برش قلم وہاں دکھلائے شہسواری
جب توسن تصوّر کہا تا سکندری ہو

خاکِ قدم ہو اس کی۔ اہلِ نظر کو سونا
جو نقشِ سُم ہے اُس کا وہ مُہر اکبری ہو

تو اس پہ برسرِ زیں۔ جوں رحل پر ادب سے
اُمّ الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو

کس وصف کی ہو سیڑھی ہاتھی پہ تیرے موزوں
کرتا نہ فیل گردوں جس کی برابری ہو

اس طرح جلوہ گر ہے تو برسر عماری
برج حمل میں جیسے۔ خورشیدِ خاوری ہو

چار آئینہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو
اور سر پہ اُس کے ٹوپی فولاد کی دھری ہو

پر جیسے آئینہ سے۔ تیرِ نگاہ گذرے
یوں غرق اس میں تیری۔ ہر تیر کی سری ہو

کیا سعد و نحس کا یاں رہوے حساب باقی
جب چھائی آسماں پر۔ فرخندہ اختری ہو

ختمِ ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر
تو مدعا پہ اس کی گر ملتفت ذری ہو

جو ہو ترا دعاگو گلرنگ ہو وہ کھل کر
بدخواہ اگر ہو خنداں صد برگ و جعفری ہو

ہو سیر بخت تیری گر اوجِ میمنت پر
رفتار بخت اعدا بر رجع قہقری ہو

قصیدہ نمبر ۸

یہ قصیدہ ایامِ طالب علمی کا ہے۔ مطالب اس کے عہد مذکور پر شاہد حال ہیں۔ افسوس کہ نظرِ ثانی سے نور نہ پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام
ہے پئے افلاک لازم نفی خرق و التیام

تاخط محور پہ ہووے گرم گردش آفتاب
تا نہ قطبین فلک تک پہنچے دور صبح و شام

سبعہ سیارہ ہوں سائر تا سر ہفت آسماں
ہو ثوابت کا سپہر ہشتمیں پر ازدحام

منجمد ہو کر میانِ طبقہ ہائے زمہریر
قطرہ افشاں تا بخار ابر ہوں بن کر غمام

آب باراں سے گذر کر منتشر تا ہو شعاع
انعکاس رنگ سے قوس قزح پائے نظام

تا حقیقت کے لئے لطفِ سخن ہووے مجاز
صنعتیں ہوں اُس سے پیدا بامرام و بے مرام

تا کریں روشن معانی و بیاں سحر بدیع
جن سے ایرادِ معانی ہو بہ تحسین الکلام

تا اَنْ و لَنْ کَیْ اِذَنْ دیں فعل مستقبل کو نصب
جازمِ فعل مضارع اِنْ و لَمْ لَمَّا و لام

تا کہ علم شعر ہو داخل بہ اوزانِ بحور
تا افاعیل و تفاعیل اس سے پائیں انقسام

اور زحافوں کا عمل لیکر ردیف و قافیہ
گرعرب کا ہے عجم میں انکو دے موزوں مقام

تا اطباء زماں کو ہووے علمِ طب کے ساتھ
غور نبض و فکر بحراں ۔ فکر الوان قوام

ناخس و حکاک لازع ۔ رحوۃ و ثاقب ثقیل
جبتلک امراض مہلک کا اطبا میں ہو نام

یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے

کلیات خمسہ ہوں منطق میں ایسا غوجیا
یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرضِ عام

مادی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ
علتِ غائی پہ دیویں اہل دانش انصرام

تا ریاضی و طبیعی سے بزور فلسفہ
فیلسوفاں جہاں علم و عمل میں لیویں کام

تا کہ بیت سعد اکبر ہوں فلک پر قوس و حوت
تا کہ جوزا اور حمل میں شمس کو ہو احتشام

سنبلہ کو تا نجم کہوے ہے شاید عقیم
تا کہ ہو دست و بغل جوزا فلک پر شادکام

حکم ہو برجیس و کیواں کا روانہ چین و ہند
تا کہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام

تا خراساں مہر کو ۔ بہرام کو ہو ملکِ ترک
ماوراء النہر پہ ناہید کو تا ہو قیام

تا کرے معلوم اصطرلاب سے اختر شناس
ارتفاع ہر ستارہ روز و شب با صبح و شام

تا زحل کے ساتھ مشکل عقلہ وانکیس کو
زائچہ میں دیتے ہوں صاحب رہل نسبت مدام

ہووے دائر عرصہ برزخ میں تا بحثِ حکیم
ہوں مذہب جبر اور تفویض میں اہلِ کلام

رد کریں تا دعوئے رویت کو اہل اعتزال
اور ملاحد وسوسوں سے دیں نبی کو اتہام

محو ہو جبتک کہ جوگی شغل استدراج میں
ببنہ وسر میں رکھے مرغ نفس کو اپنے نظام

تاکہ سالک مسلک تقوےٰ میں کرتا ہو سلوک
تا رہے مجذوب مست بادۂ غفلت مدام

تا وجود پاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظام اہل عالم ہووے عالم میں تمام

تا خراسان و عراق و زابل و تبریز سے
نغمہ ریز فارس آباداں کرے اپنے مقام

مدہم و پنچم ۔ کھرج گندھار دھیوت اور نکھاد
نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

تاکہ فروردی ۔ ابارو ۔ آب ۔ ایلول اور ڈیل
ماہ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام

یارب اس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں
دولت اس کی ہو کنیز اقبال ہو ادنےٰ غلام

کون وہ یعنی محمدؐ شاہ اکبر دیں پناہ
نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام

زور دینداری سے جس کی ہے دکھاتی خودبخود
بیخ و بنیان ضلال و کفر شکل انہدام

کیا تعجب ہے اگر اُس کی بہار فیض سے
گلشن گیتی ہو رشک روضۂ دارالسلام

مرغزار عالم اس کی فیض سے ہے بسکہ سبز
پائے ہے رنگ زمرد پارۂ سنگ رخام

کہکشاں سے لے عصائے نقرئی پیر فلک
کرتا ہے وقت سواری شکل چاؤش اہتمام

لے شمیم خلق اگر اُس سے تو ہو جائے ابھی
طبلۂ عطار کی صورت معطر ہر مشام

گلشن مدح و ثنا سے اس کے اے گلچین فکر
لا گل مضمون تازہ جلد بہر اشتمام

محترم یوں ذات عالی ہے بہ جمہور انام
حلقۂ تسبیح میں جوں سر برآوردہ امام

مائدہ اور من و سلویٰ کی کسے ہے احتیاج
مطبخ عالی سے تیرے سبکو پہنچے ہے طعام

بہرہ ور خورشید سے کوہ بدخشاں ہے فقط
نیر اجلال کی تیرے نظر عالم پہ عام

غنچۂ تصویر کو بھی مثل گلہائے چمن
ہے نسیم لطف سے تیرے ہوائے ابتسام

ق

ہے ملا دست سخا کے ساتھ تجھکو زور حکم
دست قسام ازل سے بسکہ وقت انقسام

فیض تیرا ہے کہ پائے خرقۂ ماہی درم
حکم تو دیوے تو ہووے زیر دریا تشنہ کام

دشمنِ بدبیں کو آبِ خضر بھی زہراب ہے / اور دم عیسے گلے ہیں برشِ آب حسام
پر ہوا خواہوں کو تیری مرحمت سے خسروا / فیض انفاس الٰہی ہیں نفوس انتسام
دست صحت سے ہے رگ ہر سنگ کوہ و دشت میں / نبض سالم کی طرح جنبش دکھائیگی دوام
دیں مریضوں کو دم عیسے تو یوں نکلیں وہاں / قطرۂ ریزش گریں جسطرح سے وقت زکام
مستفید نور کب ہے شمس سے جرم قمر / نیرّ اجلال سے تیرے جلا لیتا ہے دام
روبرو دست کرم کے ہوتی گرد و باد ہے / آبروئے ابر گوہر بار اے ذوالاحترام
تو جھروکوں میں جو بیٹھے آکے بہر عدل و داد / شیر و آہو گھاٹ پر جمنا کے ہوں آپس میں رام
تا نہ آئے زخم عاشق کے دل ناکام پر / تیغ ابرو پر بتاں رکھتے ہیں وسمہ سے نیام
ق اے فریدوں تو جو کرے راہِ خونریزی کو بند / اور لبوں سے جام کے چھلکے رحیق لالہ خام
شانہ ضحاک کی مانند ایک ایک اسکی موج / مار پیچاں بن کے ہووے متحد باخط جام
معجز انصاف سے تیرے سر دشت و جبل / ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام
قصد صید اس کا کرے کوئی معاذ اللہ اگر / ہو خدا کا قہر نازل اس پہ بہر انتقام
آیا جب تیرے مقابل اے نہنگ بحر رزم / شکل خرچنگ اُلٹے پانوں ہٹ گیا دستان سام
گنج استقلال پر ہے قفل اگر تیری سپر / وقت پر شمشیر ہے مفتاح ابوابِ مہام
جوں عصا حضرت موسےٰ سر دریائے نیل / نیزہ تیرا لشکر اعدا میں کرجاتا ہے کام
ہے خدنگِ تیر تیرا یا ہوا پر ہے عقاب / دمبدم دے ہے قضا کا اڑ کے اعدا کو پیام
گر عدو سدّ سکندر کو کرے چار آئینہ / آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام
تیر سے صف ناوک اندازی پہ تیر انداز گر / مطلع برجستہ کو ہے لکھ کے دیتا انتظام

بر سر پرواز ہوں جب تیرے شہباز سہام
جوشن جسم عدو میں ہووے دم محبوس دام

دست دہقاں میں فلاخن شعلۂ جوالہ ہو / لیں ترے برق غضب کا کشت اعدا پر جو نام
گر سحاب قہر تیرا ہو تگرگ افشاں تو ہو / حال اہل قاف وائے خسرو عالی مقام

وادیٔ بطحا میں جیسے برسر اصحاب فیل
معجز طیرًا ابابیل آیا وقت انہزام

جنبش خامہ سے میرے سرد ہو برق جہاں
گر کروں شاہا رقم وصف سمند تیز گام

ترک تازی میں پڑی تھی اسکی شوخی پر نظر
ابلق چشم بتاں کی ہو گئی تر کی تمام

صفحۂ غبرا پہ کھائے نقطۂ رمال رشک
دیکھے نقش سم جو اُس کا جلوہ گر وقت خرام

سرعت طی منازل کا لکھوں گر اُسکے وصف
حال و مستقبل کا داخل فعل ماضی میں ہو نام

عرصۂ چوگاں میں جب اسکو بوقت معرکہ
لائے جولانی میں دیکر جنبش دست لگام

گاہ سرپٹ گہ اڑاں اور گاہ میٹھا پوئیہ
گاہ دلکی ابیہہ اور گاہ جائے شاہ گام

اور اشارہ ہو اگر اس قاف سے اُس قاف پر
اس طرح اڑ جائے جوں مرغ نظر بالائے بام

فیل کو تیرے شب یلدا تو کہتا ہے جہاں
پر جو ہے نقش قدم اس کا وہی ماہ تمام

یا سیہ خیمہ ہے لیلی کا دیا ہے تھم گئی
جان قیس نفتہ دل بنکر دھواں شکل غمام

حلقۂ زلف بتاں کب کھائے ہے یوں پیچ و تاب
جب اُٹھا خرطوم کو اپنے کرے ہے وہ سلام

منزل توصیف کو کیونکر تری طے کر سکے
دم کہاں پیک خرد میں یہ خیال اسکا ہے خام

تہنیت کو ہے دعا پر ذوق کرتا مختصر
ہو مبارک تجھکو باعیش و طرب عید صیام

جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں
اور ہوا خواہ ہوں کے دل ہوویں ہمیشہ شاد کام

قصیدہ نمبر ۵

افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا *

صبحدم فکر جو تھا سیر فلک کا مشتاق
عرش پر اُڑ گیا اک آن میں مانند براق

چمک اس برق جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر
افق طبع پہ دکھلائے فروغ اشراق

شعلۂ رنگ حنا کر کے اُڑا دیوے ابھی
قفس دل میں جو ہیں بند طیور اشواق

رات مجھکو یہ فلک گرد وہاں لیکے گیا
کہ عقول عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

فلسفی دہر کے جو جو تھے ہوئے مشائیں
نور اشراق سے بھٹے ہو گئے سب اہل رواق

تھے سعادت سے جو سب برج فلک مالا مال
بخت و دولت سے یہ لبریز تھا ہر قصر و رواق

تھی تعجب کی نہ جا بار جلالت سے ہو گر
حرکت چرخ گرانبار کی قطبین پہ شاق

انجم ثابت و سیار سعادت سے بہم
یوں نظر آئے کہ جوں دست و بغل اہل وفاق

نجم ناہید۔ لقب جس کا ہے رقاص فلک
تھا چپ و راست بہ آہنگ رباب و عشاق

بدر تھا پل میں قمر۔ پل میں نظر آتا ہلال
خدمت دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق

اسکا طنبورہ جو دیتا تھا سروں کو ہتات
جرم خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اشراق

نیر گردونکا خوشی سے تھا جو ل لہراتا
دف کے ترتیب ثریا کو باقسام ایاق

جلترنگ ایسی بجاتا تھا کہ سب وجد میں تھے
لعبتان فلکی صورت اہل اذواق

نظر آجاتا تھا گر اختر و مدار کوئی
دیتا مریخ دم تیغ سے اُس کو الحاق

ہاتھ پھر مار کے جو رنگ کا اک پھرتی سے
دم میں تھا اپنے طپنچہ پہ چڑھاتا چقماق

جو چلا پارۂ تن اس کا سوئے عالم خاک
بہ اُڑا اسپہ تڑاقا وہ اڑا اسپہ تڑاق

سعد اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضی فلک
حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربط وفاق

ہوتا زاہد بھی تھا آمادہ پیئے دامادی
زال دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دیکے طلاق

چرخ ہفتم پہ فلک ہے تو بطئ الحرکت
عالم خاک میں پر ہے تگ و دو کا مشتاق

فتح تفریح سے پر باد ہے گردوں کا شکم
لیکن اس وقت میں نقیبہ بہت اسکو ہے شاق

ہے جو ہر کوچہ میں آرائش نوبت خانہ
خالی آواز دمامہ سے نہو کوئی رواق

یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزم طرب
گلشن عیش و طرب کیوں نہ ہو بزم آفاق

آج وہ روز ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید
بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دل اہل مذاق

بزم خسرو میں چل اے بار بد بزم سخن
سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

تیرا قانون ترے پاس خط مسطر ہے
چھیڑ دے زابل و نیریز و خراسان و عراق

تیرے نغمے تیرے مضموں ہیں بہ شہنائے قلم
دلکشی پر ہے ترے ست کمر بستہ و چاق

زمزمے مدح کے لکھ اس کی جسے کہتے ہیں سب
کون وہ یعنی شہنشاہ محمّد اکبرؔ
طبع وقّاد کی گر اُس کی رقم ہو توصیف
نیّر جاہ سے خورشید ہلال آسا ہے
عطر سے شیشۂ افلاک ہو دم میں لبریز
خسروارات کو تھا منزل دل میں میرے
اُسکے خرجینوں سے چُن چُن کے میں لایا ہوں متاع
تو ہے وہ نسل خواقین بہ تتار آفاق
گر ترا مہر طبیعت ہو بہ جوزائے غضب
گر نہ دے حکم تو پھر ابر کے سینہ میں کبھی
تر زباں وصف میں سب ہیں ترے طفلانِ نبات
تیرے شیلانِ[4] کرم پر ہے زمانہ مہماں
گر سبق لیں نہ ترے فلسفۂ حکمت سے
ہوں نظر سے کبھی باہر نہ غوامض کے طیور
درک امراض کریں جبکہ انامل تیرے
دیکھکر نجم سعادت کا ترے حسنِ طلوع
تو جو محراب عبادت میں رکھے سر بسجود
پاس دیں تیرا جو زنّار کی چاہے تبدیل
ہوگیا تیغ سبہ تاب سے ہے سُرمہ گلو
رعب شمشیر ترا یوں ہو سپر سے وہ چند

نائب ختم رسل ۔ ظل خدائے خلاق
دستِ بخشش سے خجل جس کے ہے بحرِ آفاق
چہرہ اختر کا ہو اور ماہ سے آئے محاق
کاہشِ رشک سے رکھتا ہو بس استدقاق
ہووے گر نخلخہ سا اس کی نسیم اخلاق
کارواں شہر سمرقند کا رکھتا اتراق[1]
مدح حاضر کے لئے تیرے بہ صد استغراق
جس نے توران سے کیا ہند میں آکر قشلاق[2]
زہر یار اپنے آرامِ جہاں ہو ییلاق[3]
رحمتِ عام نہ ہو مایۂ ماءِ مُہراق
دایۂ غیب سے پلواتا ہے شیر اشفاق
مہ و انجم سے فلک پر ہیں مہیا اطباق
اہل یوناں پہ نہ ہووے حکماء کا اطلاق
تیرے شہباز فراست کا ہے یہ استحقاق
نبض آسا متحرک ہو رگ سنگ سماق
مادر شب پسر مہ کو کرے شرم سے عاق
طاق مسجد میں جھکے آگے سر ہفتم طاق
دوش گردوں پہ خطِ منطقہ ہو خط نطاق
دم نہ مارے گا ترے آگے حسود بقباق
جیسے نقطہ سکین ایک کو دیں اہل سیاق

[1] ۔ فرود آمدن بہ منزل ۔ [2] قشلاق ۔ گرم ملک جہاں سرد پہاڑوں کے لوگ آکر سردی کے دن بسر کریں ۔ ١٢
[3] ییلاق ۔ سرد ملک جہاں گرمی کے دنوں میں آرام کریں ١٢ ۔ [4] شیلان ۔ دسترخوان شاہ ۔ ١٢

ہو ترے فیض تکلم سے شفا عام تو ہو
زہر کی جا دہن مار میں پیدا تریاق

عدل نے تیرے شہا دفع یہ کی خونریزی
فصد کی منع اطبّا نے پئے رفع خناق

اللہ اللہ رے لشکر کا ترے خیل و حشم
ہم عدو جس سے نہ از یک ہو نہ ہمسر قلماق

تیرے دربار جلالت کے جو ہیں میر غضب
کہکشاں کو ہیں سر دوش لئے مثل چماق

اور ایک مطلع دلکش نے طبیعت سے مری
ہے ترے عدل کی تعریف میں پایا الصاق

اُٹھ گیا مدرسۂ دہر سے یہ شر و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبد بے در میں رہینگے محبوس
دم نہ مارینگے مگر گونج کے شور و شلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپ جہانگرد کا میں
دے فلک از پئے پامال قلم ہفت اوراق

تن میں اس طرح سے ہے اُسکے پھڑکتی شوخی
قفس تن میں ہے جوں طائر جان عشّاق

ماہی زیر زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندھ کے فتراک میں راکب اُسکا
چرخ پر دائرے کھینچا کرے مانند نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شاہا
جودت طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سوئے فلک جیسے بہ تفریح مشام
بوئے گل جائے تنفس میں دم استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیل فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اسکی تن البرز پہ شاق

عمر بھر مطبخ عالی میں رہا نعمت خوار
صفت اطعمہ پر خام رہا جوں بسحاق

ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں انہی ہاتھوں کو لگی
نور ہمت کا زمانہ میں جو ہے عام الفاق

برسر دشمن بد کیش بہنگام دغا
گر فشوں ہووے جلو ریز بہ دشت قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اس کشور برفانی میں
شعلۂ تیغ شرربار ہو برق حراق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالم نور
جس کی مشرق سے کریں نور معانی اشراق

کر دعا صدق ارادت سے کہ ہے وقت دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوق زباں کو مشتاق

دوش گردوں پہ ہو تا فرغل سنجاب غمام
سبزہ تا خاک [illegible] پیرہن استبراق

دخترِ رز کو بہ محفلِ اہلِ تقوےٰ | جب تلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فراق
تجھکو آفاق میں ہووے رمضاں بھی مہِ عید | ہو ترے رویتِ دیدار بہ عیدِ آفاق
اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن | یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایامِ محاق

صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے ازہاق

قصیدہ نمبر ۶

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی - اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے

گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا گرہ | اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ
سینہ میں دل اگر نہ گرہ تھا تو کس لئے | ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ
اپنا دلِ گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا | غنچہ ہزار جا پہ کھلا اور ہوا گرہ
چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل | ہے ایسی چشمِ تر سے بہم آشنا گرہ
قمری ہے لائی چاک گریباں چمن میں آہ | اے سرو گل سے دے بسرِ بندِ قبا گرہ
ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر بجرمِ اشک | ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگور آ گرہ
ہیں مجمرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند؟ | کھولے ہے کار بستہ کی میری صدا گرہ
تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں | وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ
مرقد پہ میرے طرۂ شمشاد کی طرح | پھوٹے گی نخلِ شمع میں بھی جابجا گرہ
آیا ہوں میں بہشت میں لے کر گرفتگی | ہو وینگے استخواں بہ گلوئے ہما گرہ
رہویگا شکلِ دستِ حنا بستہ حشر تک | قاتل کے دست و دل میں مرا خوں بہا گرہ
گر میں گرفتہ دل ہوں - تو جوں دانۂ انار | محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ
ہیں عکس اپنا دوں تو ہو جوہر سے آئینہ | جوں دام موجِ شکلِ خطِ بوریا گرہ
عکسِ دلِ فسردہ سے مینائے بزم میں | رہ جائے شکلِ دانۂ انگور کھا گرہ

یہ زہرِ غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیرِ زلف — سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

ہیں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں — حیرت سے اینٹھ کر ہو زبانِ درا گرہ

رویا ہیں شکلِ شیشہ کبھی کھول کر نہ دل — میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

دل تنگی کا اپنے قلمبند کرکے حال — بازو پہ مرغِ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوترانِ گرہ باز کی طرح — سینے سے آنکر سرِ دوش ہو اگرہ

وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے — جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبینِ صبا گرہ

پھیلاؤں گر شمیمِ مضامیں کو ہند میں — ہووے ختن میں نافہ مشک خطا گرہ

رجعت سے نجمِ بد کی مری ماہی سپہر — خرچنگ بن کے بیٹھ رہے ایکجا گرہ

پیدا ہوں سو گرہ اگر اک دل سے کھولئے — جوں کو کنارِ لالہ و تخمِ حنا گرہ

گھنا نا ماہرو کا ہے کہتا کہ دیکھیو! — قینچی کی طرح کترے ہے چرخ دوتا گرہ

ق آہیں تو کھینچیں سینۂ صدچاک سے بہت — کھلنی تھی میرے دل کی مگر کیا بھلا گرہ

سوزن کا رشتہ بن کے کھچا جنتری میں آہ — ہے زیرِ پائے رشتہ بپا دو سرا گرہ

قطروں سے خونِ دل کے ہوں سو سو گرہ عیاں — ایک آبلہ سے دل کے جو کھولوں فرا گرہ

یہ عقدہ مثلِ ابروئے خوبانِ کینہ جو — ہے ڈالتا بہ ناخنِ عقدہ کشا گرہ

رمال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پر تو ہو — انگلی سے پوری پوری میں اُسکی جدا گرہ

ہر قطرۂ سرشک مرے روئے زرد پر — خاطر گرفتگی سے ہے جوں کہربا گرہ

یارب وہ شانہ پاؤں کہاں ہیں جو دل سے آہ — دے کھول شکلِ عقدۂ زلفِ دوتا گرہ

وابستہ تارِ موئے میاں سے ہوں شکلِ ناف — چشمِ کشاد کار رکھے مجھ سے کیا گرہ

نقطہ کی طرح مرکزِ گردش رہا صدا — میں تھا مگر بہ دائرۂ دہر پا گرہ

دل تھا گرہ خیال میں جو آکے عقل نے — یوں کھول دی بہ ناخنِ فکرِ رسا گرہ

اُس آفتاب پرتو نظر کر کہ جوں تگرگ — پل بھر میں اک زمانے کی ہے کھولتا گرہ

وہ کون یعنی اکبرِ ثانی کہ جس نے وا — تیرے بھی کام دل سے ہے کی ہا گرہ

گل کی گرہ بہار کرے گر صبا سے وا
وہ کھول دے دلوں کی بہ فضلِ خدا گرہ

لایا ہوں بہر نذر میں وہ دُرِ آبدار
ہو جس کو دیکھ آپ دُرِ بے بہا گرہ

جوں برق لکھ کے مطلع برجستہ خامہ نے
مطلع سے آفتاب کے دی ہے لگا گرہ

مہ طلعتوں میں حسن سے کی تو نے وا گرہ
کیوں تیرے دل میں خال سویدا رہا گرہ

کھلجائے نام پاک سے اک آن میں ابھی
گر ہووے کوہ مروہ کوہِ صفا گرہ

ہیبت سے تیرے نطق کے تبخالہ بنکے ہے
دعویٰ کے لب پہ آ سخنِ مدعا گرہ

چاہے جو اُس کو آبِ فصاحت کرے رواں
لکنت وہیں زباں پہ دیوے لگا گرہ

تیرے سحابِ جود سے گلشن میں صبحدم
لے مشتِ زر ہے غنچۂ گل باندھتا گرہ

گر دلِ خنک کی جانِ فروبستہ کھینچ کے ہو
مابین کوہ قاف میانِ شستا گرہ

تو ناخنِ نگاہ سے مانند آفتاب
دے کھول دم میں دیکھکے یہ ماجرا گرہ

کھولے ہیں کارِ رشتۂ عالم سے دانہ وار
تیری ہوائے لطف و سحابِ عطا گرہ

دستِ گرہ کشا نے ہے باقی کہاں رکھی
جز تکمہ ہائے پیرہنِ اغنیا گرہ

البتہ دل میں غنچۂ پیکاں کے ہے ترے
جانب سے حاسدوں کے صباح و مسا گرہ

یا جو تری کمانِ نگاریں میں ہے نمود
وہ ابروئے نگار پہ ہے خوشنما گرہ

ایکدم میں تیرے ناخنِ شمشیر سے ہوں وا
ہیں سر جو حاسدوں کے بروزِ وغا گرہ

تیرے فروغِ نیّرِ حشمت سے کیا عجب
گر مہر ہو سمٹکے بہ شکلِ سہا گرہ

اللہ رے تیری قوتِ بازو کہ مثلِ گوئے
چوگاں کے آگے کوہ کو ہے جانتا گرہ

تو چاہے گر تو دامنِ ساحل میں بحر کو
دو نو طرف سے کھینچ کے دیوے لگا گرہ

پنجے سے تیرے مہر کے گردوں پہ ہر سحر
کھل جاتی ہے ستاروں کی لا انتہا گرہ

منقار ماکیاں کی طرح ناخنِ ہلال
ہے بیضۂ فلک کی سدا کھولتا گرہ

لائے جو شعلہ حرفِ شرارت زبان پر
تاثیرِ عدل سے ہو تری لب پہ آ گرہ

اللہ رے یہم عدل کہ خون زمانہ میں
دشنہ بھی رکھے کرکے جبیں پر اِبا گرہ

ق

زلفوں کے دام جیسے حسینانِ نازنیں
ہیں ڈالدیتے دیکے بسوئے قفا گرہ

مارِ سیہ کے سر میں اسی طرح زہر مار
ہو دیگا مثلِ مہرۂ مار ایجا گرہ

انجم سے تیری سالگرہ کے لئے فلک
ہر سال کہکشاں میں ہے دینا لگا گرہ

توسن ترا زمیں پہ جو کاوے کا ڈالے نقش
سمجھیں کہ بیٹھا مار کے ہے اژدہا گرہ

جولاں پہ اپنے آئے تو جوں جنبشِ صبا
غنچوں کی کھولے باغ میں وہ باد پا گرہ

دامانِ ابرِ تر پہ وہ پاتا ہے برق نام
اُس کا شرار نعل جو جھڑے ہے اڑا گرہ

گر اُس کی گردِ سُم سے بمیدانِ کارزار
ہو گرد باد دامنِ صحرا میں کھا گرہ

لائے اُڑا کے نو اسے از شرق تا بہ غرب
کھلنے نپائے یہاں بہ جبینِ ہوا گرہ

رفعت پہ تیرے فیل کی طبع رسا نے رات
پھینکا کمندِ وہم کو جو کرکے وا گرہ

آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں
اک نقطہ مشک ناب کا ہے ہو رہا گرہ

ہے بسکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دل میں شوق
دیکھا جو نیشکر میں کہ ہیں جا بجا گرہ

کرتا ہے آشنا اُسے دنداں سے وہ فقط
اسواسطے کہ اُسکی بھی ہو دل کی وا گرہ

سلکِ دُرِ سخن میں دلا صبح تا بہ شام
جوں سبحہ دیگا بیٹھا ہؤا تا کجا گرہ

وا کر لبِ سوال بدرگاہ ذو الجلال
تا رہ نجائے سینہ میں دل کی دعا گرہ

غلطاں بزیرِ گنبدِ گردوں ہؤا کرے
بن بن کے تا زمانہ کی صبح و مسا گرہ

تا چرخ واژگوں پہ شاخِ کہکشاں
ہو خوشہ وار عقدِ ثریا سدا گرہ

میدان ہو نا سپہر کا اور گوئے ماہ و مہر
اور دور مہ سے ہو ذنب و راس تا گرہ

تا دل گرفتگی سے زمانہ کی بزم میں
ہر دم گلوئے شیشہ میں ہو قہقہا گرہ

حبِ نبات کو پئے دردِ مریضِ عشق
تا دیں بنجالِ لبِ بُتِ شیریں ادا گرہ

جب تک شمیمِ کاکلِ پیچاں کے رشک سے
نافہ میں ہووے مشکِ ختن بے خطا گرہ

ہر سال تجھکو جشنِ مبارک ہو خسروا
اور مشکلاتِ خلق کی ہوں اُس سے وا گرہ

پر تیرے مدعی کی نہ وا ہووے جوں حباب
ہرگز محیط دہر میں غیر از فنا گرہ

قصیدہ نمبر ۷

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی - اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے -

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار
تو اپنے نقش مٹادیں جہاں کے جادوگار

سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ
زباں سے اُسکی ہیں وابستہ اُنکے سب اسرار

سوار توسنِ دستِ رواں پہ ہووے یہ جب
کرے قلمروِ معنی کو دم میں باجگذار

جو شاخ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں
تو اُڑ کے صورتِ شاہیں کرے یہ اُسکو شکار

زبانِ تیغ نگہ سے لیا فسوں شاید
کہ اِس پہ اُڑ کے مضامیں ہیں کرتے جی کو نثار

ہیں دست بستہ کھڑے چاہوں باندھ لوں جسکو
کہ لفظ و معنی و مضموں ہیں بے شمار و قطار

ہے کرتی کام جہاں جاکے اُس کی نوکِ زباں
قلم دبیرِ فلک کا ہے واں پڑا بے کار

سخن زبان پہ ہے اور ہے نگاہِ دل دل پر
کہ تسو ہیں دل تو ہر ایک کی ہے اپنی اپنی بہار

سخن شناس اُنہیں دیکھ کر یہ کہتے ہیں +
کہ جو گہر ہے وہی اس میں ہے درِ شہوار

کروں میں اُس کو مگر کیا کہ مشتری نہ رہے
متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار

شرابِ دَرد سے دل ہو گیا ہے مست ایسا
کہ شامِ روزِ جزا تک نہ جسکا اُترے خمار

بنائے ناوکِ تقدیر خاک تو وہ جسے
بچا سکے اُسے کیا خاک بُلبلے کا حصار

ہزار درد اسے بیدردی زمانہ دکھائے
زباں پہ لایا نہ لائے گا شکوہ یہ زنہار

ق
ہیں لایا سینہ میں تھا دل کی جا پہ آئینہ
کہ اہلِ دل اسے سمجھینگے مطلع الانوار

سو اُس کو توڑا ہے لوگوں نے سنگِ باراں سے
میں کہتا تھا کہ گہر بار ہونگے یا گلبار

صفا کا اُسکے ایک ادنےٰ سا وصف یہ دیکھو
غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو آپ ہے بار

ہیں آبگینہ کے آگے ہوں آپ شرمندہ
کہ ایک بات سے پڑتے ہیں بال اس میں ہزار

مگر ترددِ ایام کیوں کروں اے چرخ / نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار

لے آیا حسنِ مقدر اُس آستاں پہ مجھے / کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جبہ لیل و نہار

سحاب جود سے اُس کے زمانہ ہے گلشن / نہال ابرِ کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سُن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں / کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی / کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار

سو میں زباں کو گیا لیکے دل کے دریا میں / مذاق آب گہر میں ہلا لیا کئی بار

اور اُس کے بعد ہوں کہتا کہ نام پاک ہے وہ / جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

خدا کا سایہ ہے - اور نائب رسولِ خدا / محمدؐ اکبر عالم نواز و عرش وقار

ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت / بدیں پناہ و بدل دولت و بہ رخ انوار

خداشناس و طریقت نما حقیقت بیں / بدست جود ہے دریا - بہ تمکنت کہسار

نہ حقِ وصف ہو اُسکا ادا کبھی لب سے / زباں بھر سر مو آکے گر کرے گفتار

ہؤا ہوں لیکے میں حاضر بہ تہنیت کے پھول / کہ اَور پاس نہ رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شہا! ہے آج اُسی شاہزادہ کی شادی / جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاہ نشاں / وہ شاہزادہ جواں ہے ولے کہن کردار

پڑھوں حضور میں ایک مطلع دعائیہ / قبول جس سے دعائیں ہوں بر سرِ دربار

شہا خدا سے یہی ہے مری دُعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

شکوہ شادی شہزادہ کس زباں سے کہوں / کہ جوں شگاف قلم بند ہیں لب اظہار

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

جو لکھنے بیٹھا میں ساچق کا وصفِ آرائش / تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خطِ گلزار

یکایک اُتریں پرستاں سے آنکر پریاں / ہوئیں جو تخت ہوائی پہ ناچنے کو سوار

ہجوم عیش و طرب اس قدر زمیں پہ ہؤا / دبیرِ چرخ سے بھی ہو سکا نہ اُس کا شمار

یہ لعمتانِ فلک پر ہوا خوشی کا جوش | سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

(بیاں سے کئی سطریں پڑھی نہ گئیں - آگے چند شعر متفرق آتشبازی کے ہیں)

شبِ برات کی وہ روشنی کہ صلِّ علیٰ | ہو روز عید اگر آئے سامنے شبِ تار

جو ٹٹیوں پہ ہوئی روشنی تو شور اُٹھا | فلک نے کھینچی زمیں پر ستاروں کی دیوار

دیا ہے لایا ارسطو طلسمِ یوناں سے | کھِلایا سدِ سکندر میں چین کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتش باز | تو بولے اہلِ نظر دیکھنا ہے طرفہ بہار

یہ دینگے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو | تو آکے ہوینگے طاؤسِ خلد انپہ نثار

جب اک طرف کو لگی جگمگانے چادرِ گنج | زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانوں کے پردے تو اُڑ گئے اُسدم | پٹاخے کرنے لگے چھٹکے جب بہم تکرار

پکارے سب کہ قواعد ہے فوج میں شاید | کہ فیر اُڑ رہے ہیں ہر صف میں قطار قطار

عجب تماشا ہوا تیلیوں کو جب دی آگ | کہ ناچنے لگے مل کر ثوابت و سیّار

ہوائی کہتی تھی جا کر شہابِ ثاقب سے | کہ تو زیادہ ہے یا میں فزوں بعرش آتشبار

ہیں ابرِ طور سے برسے زمیں پہ نور کے پھول | زمیں تو تودۂ گل ہیگی آسماں گلبار

(کئی شعر اور پڑھے نہ گئے)

اب اس دُعا پہ قصیدہ کو ختم کرنا ہے ذوق | کہ دوست تیرے سرافراز اور عدو ہوں خوار

پر اس ہوس کی ابھی چھٹ رہی ہے بیتابی | قلم میں سالِ عروسی کا پھول دیوے بہار

اسی خیال میں تھا دیکھنا خدا کی طرف | کئے خموشی فکرت نے والب گفتار

کہو سرِ لب بستہ سے شادیٔ فرزند | مبارک آپ کو ہوئے شہِ سپہر وقار

۲ + ۳۰	جو ہو ویں اُسکے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز ہوں اُسکے دشمن بدکیش خالدٌ فی النّار	۱۱۹۳ ۳۲ ۱۲۲۵

قصیدہ نمبر (۸)

اکبر شاہ مرحوم کی مدح ہے۔ عالم شباب کا کلام اور نظر ثانی سے محروم ہے۔

اُفقِ دلپہ مرے عیش و طرب دونو بہم
آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام

ایک کا ایک ہے وہ ربطِ سخن تھا گویا
دو لب یار ہیں یا حضرت عیسےٰ ہمدم

روشِ ناز پہ ہمروش تھے یوں جیسے کبھی
لام الف لکھنا تھا اسلام کا یاقوت رقم

یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل
یا کہ پیوند تھے دو نخلِ گلستانِ ارم

ملکے دو تار نظر ایک ہوئے تھے دونو
یا وہ اک بینی کے دو پرّے تھے باہم ہمدم

دونو پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں
کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعدِ پُرخم

ایک معنی کے وہ لفظِ مترادف تھے دو
ایک مضموں کے دو فقرے تھے مگر مستحکم

تھے جڑے دو دُرِ شہوار کہ ہرگز نہ ملیں
ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم

ایسے تھے دونو وہ یکدل کہ دو قالب یکجاں
یک زباں دونو وہ اس طرح کہ جوں چاکِ قلم

آئے لپٹے ہوئے یوں عالمِ سرشاری میں
نالۂ زیر کی ہمراہ ہو جوں نالۂ بم

میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونیکا
تو ہاتف نے کہا غیب سے ہو کر ملہم

کیوں معموں کے دلِ تنگ میں معنی ہوں بہ تنگ
جب ہے معلوم تو پھر بات ہے یہ کیوں مبہم

آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طرب
کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم

کون وہ ظلّ خدا۔ شاہ محمد اکبر
جس کی ہمّت سے ہوں دریوزہ گرِ ارباب ہمم

شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم
ہو سلامت روی اُسکی بہ سلامت مُنضم

اس لئے عیش و طرب مثلِ قرانِ السّعدین
متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اس دم

یُمن اس عقد نے بخشا ہے جہاں کو ایسا
جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم

آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر
دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم

دنیا نسلوں میں ہے پیوند بدیہ الانتاج
یہ قلم سمجھے نہ تہذیب نہ جانے سلّم

بزم عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظارہ
پڑھتا یہ مطلع رنگیں ہے وہ ہو کر خرم

ہے اُٹھا عیش کا طوفان سرِ ساحلِ یم
زمزمہ موج کا ہر ربط سے ہؤا ہے ہمدم

گٹکری کا سا ہے ہچکا یہ گلوئے بینا
ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم

لوگے جس سازِ خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑو گے کھرج کا تو سنو گے پنچم

اثرِ نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام
وجد میں آئیں سنیں آج گرا ہوئے حرم

تار طنبور بنی آج رگِ سنگِ صفا
بے زباں زمزمہ سازی کرے موجِ زمزم

نہیں کچھ دور کہ تبدیل ہو کعبہ کا لباس
تاکہ دکھلائی نہ دے صورتِ اہلِ ماتم

دھوم اس شادی کی یہ ہے کہ منڈھے کی بصورت
چھا گیا گلشنِ آفاق پہ ہے ابرِ کرم

رقعۂ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا
کہ جوانانِ چمن آئیں جو مل کر باہم

شاخِ گل پہنے کلائی بنی کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطر دانیں گلِ نرگس وہ بھرے عطرِ سہاگ
سارے گل بھرنے لگیں بلبلِ بیتاب کا دم

بل بے تیاری پوشاک کہ چرخِ اطلس
لایا اطلس جو لگانے تو یہاں نکلی کم

یہ خیاطہ کی ہے جلدی کہ کھلا جاتا ہے
شکمِ کرمِ بریشم ہی میں تارِ ریشم

یہ چڑھاوے کی ہے کثرت کہ جھڑے ہے ہر صبح
ڈگڈگی پر گلِ داؤدی کے ہیرے شبنم

اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ
جس کی انگلی میں پنہائیگا سلیماں خاتم

ہوئی نوبت کی یہ نوبت کہ سحر اُس کی ٹکور
گوشِ افلاک سے بھرتی ہے سوا گوشِ اصم

نئے قلیاں کو بھی گر منہ سے لگاتا ہے کوئی
تو وہ بھرتی ہے ہم آوازی شہنائے کا دم

پہنچا یہ طنطنۂ کوس کا گردوں پہ دماغ
کہ نہیں رکھتا سر سوئے زمیں اپنا قدم

آتی اسطرح سے پیہم ہے جلاجل کی صدا
کہ پری زاد ہے آتی کوئی کرتی چھم چھم

کتنا ہر دم ہے یہ نقارچیِ پیرِ فلک
کہ گھٹا مدت سے دمامہ کا مرے پھولا شکم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اس شادی میں
چو گھڑے روپے کے اور سونے کی تھلیاں انمیں
ہے یہ سلک دُرِ شہوار بگوشِ بہجت
ہر سبو چے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ
دیکھ نقلوں کو سبو چوں میں حیران ہے خلق
ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پر ان کو
کروں تحریر جو رنگت کو حنا بندی کی
ہوئے روشن جو کنول شکل رخِ آتشناک
کاغذِ زرد کے پھولوں میں گگل کترے تھے
نخلِ آرائش اگر دیکھو تو ایسے دلکش
بیاہ کی شب وہ تجمّل تھا کہ اللہ اللہ
سیج کھو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے
دیکھے دولہ کے نہیں دستِ حنا بستہ ابھی
مُنہ پہ نوشاہ کے یوں سہرہ زرتار کی زیب
ہوا اشہب پہ فلک سیر پہ دولھا جو سوار
وصف میں اُسکے پڑھوں کیونکہ نہ اک مطلع میں

قطعہ

اسکے سینہ سے جو نکلینگے بآوازۂ بم
صف بہ صف دیکھ کے انکو یہ پکارا عالم
یا کہ ہنستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم
اپنے اُبھرے ہوئے پستاں پہ چڑھاوے محرم
کہ بھرے موتیوں سے کیونکہ حبابِ لبِ یم
وصفِ شیریں سخنی پائے زبانِ ابکم
شاخِ گل مہدی ہو پھولوں سے ابھی میر اقلم
تو لٹیں مُنہ پہ دھوئیں کی ہوئیں زلفیں پر خم
آگیا تھا گلِ صد برگ کا پھر کر موسم
نوجوانانِ چمن جیسے بصد ناز و نعم
کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم
کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمہیں آنکھوں کی قسم
ورنہ مٹھی کا ابھی غنچہ کے کھل جاتا بھرم
رشتۂ خورشید پہ جوں خطِ شعاعی کی جھلم
روز نے صدقہ کیا اشہبِ شب نے ادہم
توسنِ طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم

یار ہمدم نہیں لیکن ہے وہ نسلِ آدم
ہے وہ اُس نسل میں جس اصل میں رخشِ رستم

رمز راکب سے یہ آگاہ وہ صرصر رفتار
ہے تو وہ حور شمائل ۔ نہیں پر زادۂ حور
چادریں بھیجتا مہتاب کی ہے بسکہ فلک
نور کے قطرے فلک سے ہیں زمیں پر گرتے

گذرے گر دل میں توقف تو وہیں جائے ہے تھم
خوئے آدم ہے ولیکن نہیں نسلِ آدم
چاہئے اس کو زمیں پر نہ گلیم و نہ گلم
چھوٹتے گنج ستاروں کے کہاں ہیں پیہم

سر اُٹھایا یہ ہوائی نے ہے آخر کہ ہُوا
شعلہ اس کا علَمِ کاہکشاں کا پرچم

ٹہنیاں جھومی ہیں اس رنگ سے نافرمانکی
جیسے رکھے ہوں تراشے ہوئے جامِ نیلم

ہاتھی لڑتے نہ سمجھنا۔ بلِ عشرت نے بزور
سر کو دو کوہ کے ٹکرایا ہے مانندِ غنم

نخل پھولا ہُوا دم بھر میں نکل آتا ہے
ہے اناروں میں اچنبھے کا تماشا عالم

چھوٹے گھن چکّر اس انداز سے کھا کر چکّر
چرخ میں آیا جسے دیکھ کے گردوں دژم

پھولیں کیونکر نہ چمک کر گلِ آتشبازی
شاخ تھی گل کی قلم۔ بنگئی شورے کی قلم

جھاڑ ابرک کے نہیں چادرِ مہتاب کے ہیں
جڑ تلک لپٹے ہوئے نخلِ گلستانِ ارم

شجرِ طور کا جوں وادیِ ایمن میں ہو نور
شمع ابرک کے کنول میں ہے دکھاتی عالم

ہیں جو سرگرمیٔ شادی سے فتیلے روشن
تاب کیا خانۂ گیتی میں رہے سایۂ غم

باندھے سو شعلۂ فندق بسرِ ہر انگشت
پنج شاخوں کو کہوں میں نہ کبھی دستِ صنم

کھولا مصحف۔ تو نے ہے یمن کو سرِ لوحِ ورق
اسمِ اعظم تھا عیاں خطِ شعاعی سے رقم

رونمائی پہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روئے تو دیدن ندہم

ایسی شادی کے تجمّل کو لکھے کیا کوئی
دھوم ہے جس کی گئی تا سرِ ہفتم طارم

جی میں ہے توسنِ خامہ کی عناں پھیر کے ہیں
مدحِ اکبر شہِ ثانی کروں پھر زیبِ رقم

جس کے باعث سے منوّر ہے چراغِ خورشید
جس کی دولت سے ہے آراستہ بزمِ عالم

اُس کے دین داری کے نقارہ کی اللہ رے صدا
از عجم تا بہ عرب اور ز عرب تا بہ عجم

جس سے پوچھو۔ تو آگہ ہے؟ کہیگا کہ بلے
انت نعرف کہو جس سے وہ کہیگا کہ نعم

مدح میں اُسکی رقم کرتا ہوں ایک تازہ غزل
کہ غزل خواں ہے ہر ایک آج بجانِ خرم

تو ہے وہ ابرِ سخا۔ تو ہے وہ دریائے کرم
جس میں ہوں فلس کی جا کیسۂ ماہی پہ درم

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب
مشک سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

پہنچی ہے لوحِ عدو سہم کے ناوک سے ترے
مثلِ آہوئے رمیدہ سرِ صحرائے عدم

تیرا خنجر ہے نہنگ ایسا کہ غرقِ زہر آب
تیری شمشیر وہ اژدر ہے کہ ہے آتش دم

حق میں اعدا کے ترا تیر ہے پیغامِ قضا
اور ترا جوہرِ شمشیر قضائے مبرم

توڑے دل شیشہ کا ہرگز نہ ترے عہد میں سنگ
رحم کھاوے کہ لیا اُس نے مرے گھر میں جنم

تیرے انصاف کا پرتو ہے جو عالم پہ محیط
تو نہ پایا ہے نہ پائینگے فروغ اہلِ ستم

روبرو بچۂ آہو کے نہ روشن ہو چراغ
ڈالے روغن کی جگہ اُس میں جو بہیہ ضیغم

گلشنِ مدح میں دے تیرے ترا ذوق لگا
خرمنِ گل کی جگہ تازہ مضامیں کا اٹم ق

پر یہ سمجھا کہ ہے جز کُز نا دلالت کُل پر
کہکے اک شمہ تری وصف کا اے نیک شیم

یہ دعا کرتا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے
شادی وصلت فرزند بصد جاہ و حشم

ہوں شبستاں میں ترے دست و بغل عیش و طرب
گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

قصیدہ نمبر ۹

یہ قصیدہ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا - بندۂ آزاد اُن دنوں طفلِ مکتب بھی نہ تھا جب حاضرِ خدمت ہونے لگا - تو حضرت مرحوم اکثر اُسکے اشعار پڑھا کرتے تھے ڈھونڈنے کی فرصت نہ ملی - ایک برس وفات سے پہلے فرمایا - کہ اگر ہوتا تو اُسے درست کرتے - طبیعت نے عالمِ جوانی میں بلند مضامین پیدا کئے تھے خیر اکثر اشعار اور مطالب خیالمیں ہیں - ایک قطعہ لکھدیتے ہیں چنانچہ ۲۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عیدِ قرباں کی تہنیت میں ابو ظفر بہادر شاہ کو سنایا - بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا الحمدللہ کہ یہاں تک پہنچا - اول قصیدہ لکھتا ہوں - پھر قطعہ

دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ نازِ بتاں
ثمِ تیغ اسکو غنیمت ہے کہ دیکھا لبِ ناں

ہوں وہ لب تشنہ کہ ہیں دامنِ دریا سمجھوں
برقِ پرسوز کا ہاتھ آئے جو طرفِ داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جس کے نفسِ سرد سے آہ
دم میں یخ بستہ ہو چشمۂ مہرِ رخشاں

میں ہوں وہ شعلۂ جوّالہ بزیرِ گردوں
کہ اگر دل کو قرار آئے تو جگر میں ہو جاں

ہیں وہ مجنوں جگر نفتہ ہوں جس کے دم فصد
ہر بن مو سے عوض خون کے نکلتا ہے دھواں

چشم سوزن سے نہ لو سلسلہ زنجیر کا تم
دل وحشت زدہ ہے لاغر و بے تاب و تواں

ہوں وہ افتادہ کہ ہمت کبھی یاور ہو تو ہو
دستگیر آ کے عصائے مژہ مور چگاں

ہوں وہ تصویر سر صفحۂ عالم جس پر
مو قلم دو تو کرے کار سنان و پیکاں

دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار
ایک گرہ وا ہو تو صد گرہ اندر داماں

ہوں وہ فرسودۂ غم جس کے بچشم بینش
کرتا سرو چمن دہر ہے کار سوہاں

قطرۂ شبنم کا ہو گل پر تو مری نظروں میں
سنگ حسرت ہو کہ رکھتا ہوں بزیر دنداں

ہیں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے
اور اگر ہے تو ہے آغشتۂ زہر بستاں

فلک سبز کے نیچے ہوں میں تلوار کا کھیت
آب شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے مری جاں

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمر تلف کردہ مجھے
حشر تک ڈھونڈیں تو ممکن نہیں ہاتھ آئے نشاں

ماہ نخشب کی طرح ہونا عیاں ہوں سر کوہ
اور ابھی پل میں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہاں

ہوں وہ سر گشتہ کہ گر ساقی و ساغر چاہوں
حلقہ در فلاخن ہو بدست دہقاں

اس گلستاں کی روش پر گل بازی جس میں
نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

دل نے لہو سے کیا رنگ طلا کا روشن
ترش روئی سے رخ زرد ہے مہر تاباں

ہیں وہ گردش زدہ دہر ہوں جس کا پس مرگ
سنگ تعویذ بھی چکر میں ہو مانند فساں

ہیں وہ ہوں بسمل دل اخگر شن جس کے خوں میں
تیغ قاتل روش کشتی دریا ہو رواں

اشک خوں میں ہے مرا آتش یاقوت یمن
گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

دل اُڑا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا
طائر رنگ حنا بن کے ہوا ہوں پراں

طفل معصوم کا ہے خواب مری موت و حیات
کہ یہی لب مرا خنداں ہے یہی ہے گریاں

وہ سیہ بخت ہوں میں خاک نے جس کی یکسر
ہے سیہ کر دیا آئینہ چرخ گرداں

ہیں وہ بیمار ہوں مایوس شفا جس کے لئے
دم عیسے نے کیا کار نفوس ثعباں

اُٹھ سکا سر نہ مرا مزرع گیتی میں ذرا
دل رہا دانہ روئیدہ تہ سنگ گراں

شرحِ جانسوز سے میری نئے قلیاں کی طرح
کیا عجب نائے قلم سے جو نکل آئے دھواں

دلِ ہابوس یہ تھا کہہ رہا مجھ سے کہ خرد
یوں لگے کہنے کہ بیفائدہ کیوں آہ و فغاں

پھر تو کر غور کہ مداح ہے کس شاہ کا تو
دیکھ وہ ابرِ کرم قلزمِ جود و احساں

وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر
ہنستے مہوش ہیں تو کرتے ہیں ستارے افشاں

ماہ گردوں پہ ہے اور آگے زمیں پر مہتاب
کثرتِ عیش سے دریا میں ہے شب کو رقصاں

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش ہر اک کو یہاں تک
شوقِ نظارہ ہوا عام بہ گلزار جہاں

دیکھتا ہوں کہ سرِ شاخ مژہ کا پر چشم
رخ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس واں

آج عالم کا ہے دل شاد کہ جوں عالمِ نور
جلوہ گر ہے سراورنگ بصد شوکت و شاں

ماہ فرخندہ لقب شاہ محمد اکبر
تاجِ شاہانِ زماں فخرِ سلاطینِ جہاں

دیکھا ہے دولت وصولت کا جو اس کے اقبال
دہرِ سرکش کا بھی قد ہو گیا خم مثلِ کماں

ہیچ حاضر کے لئے حاضر دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

پوچھ لو آج فلک سے کہ ہے خورشید کہاں؟
گر ہے کچھ وزن تو آجائے بسوئے میزاں

تیرے جلوہ کی تجلی نے جو روشن کیا دل
ہو گیا شمع مرے سینہ میں تارِ رگِ جاں

آستیں اپنی ہلاوے جو ترا دستِ کرم
ہر شکن سے ہو عیاں لجۂ بحرِ عماں

کیوں نہ اربابِ ہمم ہوں تری ہمت کے غلام
حق یہی ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَان

آگے دریا ترے خود کھولے ہے لبہائے سوال
کھوئے کس منہ سے کہ پنجہ بھی ہے رکھنا مرجاں

سرخروئی ترے حاسد کو جگر خواری ہے
شیر کے بال سے ہے تیز تر اس کو رگ جاں

کانپتے ہیں ترے ہیبت سے پلنگ او نہنگ
بحر و بر پر ہے تری تیغ کی برش یکساں

ہے زرہ رکھتی اسی واسطے ماہیِ تہِ آب
پہنے جوشن ہے نیستاں میں ہر اک شیر زیاں

تیغ ہندی تو کمر میں ہے پر ایک آگ جوہر
رکھتا در زیرِ نگیں ہے صفحاتِ صفاہاں

کوہ پر بیٹھ کے یوں بیٹھے بہ پشتِ ماہی
جیسے ابروئے بتاں ہو نہ آئینہ عیاں

تری خنجر کو ملا شہپر قدرت سے ہے زور
مرغ دل سینوں سے جوں زاغ و زغن ہیں پرّاں

تیر ناوک کو ترے دیکھ کے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کریگا طیراں

آتشِ قہر کی ہیبت سے تری نارِ سعیر
رکھتی شعلہ سے ہے انگشت بزیرِ دنداں

گنبدِ چرخ ہؤا کلبۂ پر دود اُسے
رنج کو سینۂ حاسد ہیں بجا ہے خفقاں

تیرا فرماں تھا کہ فرماں برِ دولت کے سوا
ہووے اک برگ نہ پیدا بہ گلستانِ جہاں

ہوئے یہ منکرِ اقبال ترے ناپیدا
کہ چمن میں نہیں اُگتا ہے گل نافرماں

ترے مہتاب کرم سے جو شررِ بزمِ قہر
پردۂ نور میں اُبلا ہے تنورِ طوفاں

عدل نے تیرے دکھائے ہیں بہم آتش و آب
آب آئینہ میں روشن ہے رخِ برق وشاں

دلِ افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے سنگِ جراحت بہ سرِ زخمِ جہاں

تیری تاثیرِ محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبز خوباں

اُفقِ صبح سے کافور کا لیکر مرہم
رکھتا مہتاب ہے بر سینۂ صد چاک کتاں

سرزنش عہد نے کی تیری یہاں تک معدوم
کہ نظر آتا نہیں دشت میں کانٹوں کا نشاں

بے علف نافۂ لیلیٰ ہے مگر قیس غریب
نہیں دیتا بہ ضیافت سرِ خارِ مژگاں

خسروا تیری توانائی اقبال سے آج
ناتوانوں کو ہوئی دہر میں تاب و تواں

مو کا سلسلۂ نقش قدم گر ہو کہیں
اپنے حلقہ میں جکڑ لیتا ہے صد پیل دماں

آگے جلوہ کے ترے پرتوِ خورشید ہے گرد
آگے رتبہ کے ترے خاک ہے جرمِ کیواں

اس تصور میں جو ہے پیشِ نظر عالمِ نور
اسکو اک مطلعِ موزوں میں ہوں کرتا بیاں

گر تری ذات نہ ہو کعبۂ اقبالِ جہاں
آسماں ہووے نہ پھر پھر کے زمیں کے قرباں

ہوسِ ناصیہ سائی تری خورشید کو روز
موکشاں لاتی ہے در پر ترے سرگرداں

مہرگاں ہمتِ عالی کا جو بادل لاوے
ابرِ نیساں سے وہ آفاق پہ ہو قطرہ فشاں

جن کی شادابی گوہر کو اگر دیکھے تو دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقاں

آتش قہر و غضب تیری عیاذاً باللہ
مشتعل ہووے اگر سوئے گلستانِ جہاں

ہے یقیں صورتِ نخلِ گلِ آتشبازی
نخلِ فوارہ بھی پانی میں رہے شعلہ فشاں

ماجرا اے خامہ نے شیریں سخنی کا تیری
صورتِ موج میں دریا کے دیا تھا زباں

سخن و اہلِ سخن سب سرِ ساحل تھے کھڑے
وہ تو لب اس کے حلاوت سے بہم تھے چسپاں

وصفِ شوخی ترے توسن کا ہو کس طرح رقم
نہ قلم صفحۂ کاغذ پہ ہے جوں برق طپاں

باندھوں کس طرح سے مضموں سواری میں اسے
تڑپ اٹھتا ہے کرے جنبش اگر طبع رواں

قلم و حرف نہیں پیشِ نظر ہیں اس دم
سرِ حاسد سے ہے دل کھیلتا گوئے و چوگاں

کہوں شائستگی اس بادیہ پیما کی میں کیا
تازیانہ ہے بکار اس کو نہ درکارِ عناں

نہیں انسان ہے مگر کام ہیں انساں سے تیز پر
پر نہیں - پردہ پری سے ہے زیادہ پرّاں

خسروا سرعتِ رفتار ہو گر مدِ نظر
پہلے ہو قاف سے تا قاف سراسر میداں

جلوہ گر خانۂ زیں پہ ہو پھر اس شان سے تو
بر سرِ دوش صبا جیسے شمیمِ ریحاں

تازیانہ جو لگاوے تو کفل پر اس کے
اور جھپک کر کبھی اڑ جائے وہ بجلی تہِ راں

ابھی کوڑے کی صدا کوہ سے پھر کر نہ چلے
وہ کئی بار پھرے واں سے یہاں یاں سے وہاں

کیا دکھاؤں ترے ہاتھی کی بلندی شاہا
آئے کوسوں سے نظر جب تو عیاں را چہ بیاں

جھومتا جھامتا آتا ہے درِ دولت پر
کہتے ہیں ساقیِ طناز سے یوں بادہ کشاں

سمتِ قبلہ پہ ہے ابر آیا سرِ دوشِ ہوا
خم پہ خم آج چلے -- جام نہ آئے یہاں

اس کی مستک پہ سپر اور ڈنگارِ خرطوم
کریں آنکھوں پہ ترا قوسِ قزح کا عنواں

اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی ہوش کی
زلف پر گل ہے دیا کاکلِ عنبر افشاں

اس کے دنداں یہ نہیں غور سے دیکھا میں نے
کشورِ زنگ میں آئے ہیں فرنگی بچگاں

کیا لکھوں آگے ترا وصف کہ منہ میں میرے
پاسِ آداب سے جوں شعلہ زباں ہے لرزاں

ختم کرتا ہے ثنا تیری دعا پر اب ذوق
کہ زباں کو بس اب آگے نہیں یارائے بیاں

تجھکو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ و جلال
عقل جو ہے تری بخت رہیں تیرے جواں

جو دعاگو ہیں ترے ان کی دعائیں ہوں قبول
صبح جشن طرب افزا میں ہو دائم خنداں

اور برنگِ شبِ دیجور ترے سب بدخواہ
روسیہ محفلِ عالم میں ہوں جوں ماتمیاں

یہی قطعہ ہے کہ قصیدۂ مذکور کی طرح میں وفات سے ایک سال پہلے تحریر فرمایا۔

خسروا جلوۂ ترا وہ طرب افزائے جہاں
کہ جسے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں

حکم دے تو جو شہا واسطے قربانی کے
سعد ذابح بھی کرے ایسا چھری کو براں

گاؤ گردوں نہ فقط خوف سے اس دم کانپے
بلکہ ہو زیر زمیں گاؤ زمیں بھی لرزاں

تو جو ہو حامئ اسلام تو بت خانہ میں
بت کرے قصد نماز اور کہے ناقوس اذاں

نیرِ جاہ شب و روز ترا جلوہ فروز
مہر تاباں کبھی ظاہر ہے کبھی ہے پنہاں

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحابِ ہمت
لیکے پنجہ میں گہر بحر سے نکلے مرجاں

اور گہر بھی ہوں وہ خوش آب جنہیں دیکھ کے دُر
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقاں

نطقِ شیریں ترا وہ ہے کہ تمنا ہیں اس کے
تر زباں موجۂ دریا ہو اگر ایک زباں

آب دریا میں ہو یہ جوشِ حلاوت پیدا
لب دریا بھی بہم ہو کے ہوں دونوں چسپاں

اس قدر تابعِ فرماں ہے زمانہ تیرا
نہ ہو گلشن میں بھی روئیدۂ گل نافرماں

ہو کے سرسبز بہارانِ کرم سے تیرے
شاخ پر گل چمنِ دہر میں ہو شاخ کماں

بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ سرِ شاخِ خدنگ
رونقِ غنچۂ گل ہو وے شگفتہ پیکاں

وہ ترا زورِ حمایت ہے کہ جس کے باعث
ناتوانوں کو بھی ہو دہر میں یہ تاب و تواں

ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں
ایک تارِ نگہ مور سے سو پیل دماں

دیگ مطبخ پہ ترے یہ فلک پر انجم
کیا عجب صورتِ سرپوش ہو گر قطرہ فشاں

پیل تیرا گلِ سوسن کا پڑا ہے انبار
گلِ مہتاب کے گلدستہ ہیں اُسکے دنداں

اُس کی خرطوم کسی دلبرِ لیلیٰ وش کی
جعدِ مشکیں ہے کہ ہے کاکلِ عنبر افشاں

لکھوں شوخی جو ترے توسنِ چالاک کی میں
جنبشِ خامہ بھی ہو موجِ رمِ برق جہاں

وقت کا وہ یکے دمِ معرکہ راکب اُس کا ‌‌ ‌ سر حاسد کو رکھے صورت گوئے چوگاں

دل میں ہیں جوش مضامین تو نہایت لیکن ‌ ‌ دل حوادث سے زمانے کے ہے بیتاب و تپاں

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیری ‌ ‌ کیا لکھے وہ تیرے اوصاف کہ قاصر ہے زباں

عیدِ اضحیٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے

تجھ پہ ہو سایہ حق اور تیرے سایہ میں جہاں

قصیدہ نمبر ۱۰

جب پہلے پہل ۱۲۴۵ھ ہجری میں سائیں نثار علیشاہ وارد دہلی ہوئے۔ بیان کیا کہ اورنگ آباد ہمارے وطن میں میاں عاشق نہال چشتی ایک بزرگ ہیں اُن کے ہم دیکھنے والے ہیں استاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جبھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور تعجب ہے کہ اُن کے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا۔ کوئی کوئی شعر سنایا کرتے تھے سائیں نثار علیشاہ اندنوں ایک سید بزرگوار کے گھر میں اُترے تھے۔ خدا کی قدرت۔ ۲۶۔ برس کے بعد اُس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس۔ پاکدامن۔ اہل اللہ۔ بی بی۔ میں کبھی کبھی اُن کی سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایکدن اُنہوں نے مجھے ایک بستہ اجزا کا دیا۔ کہ یہ سائیں چھوڑ گئے تھے۔ اُن میں دیکھوں تو قصیدۂ مذکور ہے۔ جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اس کی تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے۔ بچ تو گیا ہے۔ اللہ شہرت عام اور بقائے نام نصیب کرے۔ اصل سے نقل ہوتی ہے +

پیشانی پر یہ عبارت لکھی تھی :-

قصیدہ در مدح زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت سید عاشق نہال چشتی ادام اللہ برکاتہم

ہے ابرِ درفشاں وہ چمن میں کمال کے ‌ ‌ عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے

ہیں وہ ورسناروں میں خورشید و ماہ اگر ‌ ‌ روشن ہیں وہ تو نور سے اس کے جمال کے

اُس کی نگہ سے گر جگرِ سنگ پائے رنگ ‌ ‌ بھر جائیں پلے لعل سے دامن خیال کے

ہے بحر اُس کے سامنے کشتی بکف گدا
پھرتا صدف ہے کھولے ہوئے لب سوال کے

ہیں اُس کے در کے خاک نشینوں کے دل غنی
خواہاں وہ ملک کے ہیں نہ جویاں ہیں مال کے

دنیا نے خاکساری اُسے دی ہے نذر میں
مٹی خمیر یہ ہے گھر میں کُلال کے

ہو اُس کا حکم عام جو بہرِ منعِ انقطاع
رہ جائے آرہ چوب پہ دندان نکال کے

دل جس کا اس کے زورِ حمایت سے ہے قوی
وہ پیر زال سمجھے ہیں رستم کے زال کے

ہیبت جو اُسکی وادیِ حق میں کرے ظہور
جا بیٹھے چھپ کے شیر بھی گھر میں غزال کے

اُس کی شمیمِ خلق معطر کرے جو گُل
لے لیکے سونگھیں اہلِ چمن پھول ڈال کے

خوشبو سے اُس کی فیض کے ہوتا ہے مشکبو
ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

کیا تاب رات دن میں تغیر ہو بال بھر
وہ لائے گر زمانہ میں دن اعتدال کے

ہو شکر تنا سے اگر اس کی کامیاب
لب بند ہو ویں طوطیِ شیریں مقال کے

طائر بھی اُس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوئے
نکلے ہے پیر پیر صدا مُنہ سے لال کے

آبِ گہر ہیں ہوئے رواں کشتیِ گدا
دستِ کرم سے اُس شہِ دریا نوال کے

جی چاہتا ہے ہو کے مخاطب بیاں کروں
اوصاف ایسے شاہ کرامت خصال کے

اے سیدِ جلال کے خورشید پُر جلال
قربان جائیے ترے جاہ و جلال کے

تو شمعِ بزمِ خاص کہ پیدا کیا تجھے
صانع نے اپنے نور کے سانچے میں ڈھال کے

گردوں بھی پست ہو کے ہوا خوب منفعل
رتبہ کو دیکھا جب ترے اوجِ کمال کے

انجم جنہیں ہیں کہتے منجّم جہان کے
قطرے جبیں پہ ہیں عرقِ انفعال کے

اے شاطرِ زمانہ تصدّق ہو پیل چرخ
شطرنجِ عشق میں ترے گھوڑے کی چال کے

دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا
دریا بھی مُنہ بھنور کے گریباں میں ڈال کے

جس دل پہ تو نگاہ کرے اُس کے سامنے
جامِ جہاں نما ہے برابر سفال کے

ق
ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال
روشن ہوا کمال سے قطبِ شمال کے

سنتے ہیں جاں نثار وں سے جب تیرا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں مُنہ سے بلال کے

سر تا قدم ہیں شوق ترے طالبِ جمال
مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے

ساعت بقدرِ روز ہے! اور روز ہفتہ وار
ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے

بیتاب اس طرح ہیں ترے اشتیاق مند
جیسے طیور تازہ گرفتار جال کے

مرغِ نظر کے ساتھ اُڑا چاہتا ہے دل
مژگاں سے دونو بازوؤں پہ پر لگا کے

جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف
دھو دھو کے پاؤں پیچھے پیکِ خیال کے

شاہا یہ تیرا ذوق ہے امیدوارِ لطف
ہو حال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے

تا جلد اس کا کوکبِ طالع پئے عروج
آ جائے سمتِ اوج پہ گھر سے وبال کے

کر دے بہارِ نام سے اپنے اسے نہال
جھونکوں میں آگیا ہے سمومِ ملال کے

دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر
ایمان اسکے ساتھ ہو وقتِ انتقال کے

نکلے بہ صبحِ حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمدؐ کی آل کے

بقلم مصنف عقیدت کیش صداقت اندیش - سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق - برائے نذر جناب فیضمآب - گلشن فضل و کمال - حضرت سید عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم جمادی الاول روز پنجشنبہ ۱۲۴۵ھ ہجری قدسی مطابق ۲۴ - اکبر شاہی در قلعہ شاہجہان آباد - ع گر قبول افتد زہے عزو شرف -

قصیدہ نمبر ۱۱
در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

استاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھینگے - چند شعر لکھے تھے - جو مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے - اور آہستہ سے

کہا) اسی وقت بیگم صاحب کا حکم پہنچا ہے۔ کہ کل استاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ استاد نے کہا بہت خوب میری طرف سے انہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہؤا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے۔ اور ایک دم گرم بھر کر کہا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کے منہ بند کرتی ہے؟ میں جب قصیدہ پڑھونگا تو دیوانِ خاص کے در و دیوار سے واہ واہ لونگا۔ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے۔ وقت معین پر ایما ہؤا۔ کہ استاد اپنا قصیدہ عرض کریں۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے۔ سب صم بکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا۔ تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ۔ اور آگے آؤ۔ پاس پہنچے تو اشارہ کیا۔ کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا ہوں؟ (یعنی پھر پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے۔ خوب تعریفیں ہوئیں۔ بیگم نے بھی سنا۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ ۱۲۶۹ھ میں لکھا تھا۔

پیری میں پر ضرور ہے جامِ شرابِ ناب	پائے فروغ صبح نہ بے نورِ آفتاب
تا ثبت ہو تو اس سے کہ داڑھی ہوئی سفید	کر خوب میکشی کہ یہ ہے سیرِ ماہتاب
ہے پیر دل خنک کی ہوا پر بقائے عمر	یہ برف وہ نہیں جسے رنگیں نمد سے داب
ہستی کا اپنے کر نہ بھروسا حباب وار	تعمیر بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

۱۔ بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارتِ سلطنت ان کے نام کر دی تھی۔ اور ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا انتظام کرتا تھا۔ خلیفہ اسمعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں۔ وہ بیگم نے لے لی تھیں۔ اس لئے اسے ہمیشہ خطر تھا۔ کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ استاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ مگر استاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ نہیں کہا نہ بیگم کی شکایت کی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ ان کا قول تھا کہ زبان جوہر لطیف ہے اسے عیب سے آلودہ کرنا اچھی بات نہیں ۱۲

آئی ہے جب سے غالبِ خاکی بتن ری جاں
غافل پئے سفر ہے اسی دن سے پا بزاب

جو دم مزے سے گزرے غنیمت سمجھ کہ روز
گردش ہے آسماں کو زمانہ کو انقلاب

ہر بازیٔ فلک پہ تو نوروز روز کر
رکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب

حاصل ہے کیا ہنر سے دلا آئینہ کو دیکھ
جوہر سے دل میں رکھتا ہے کس درجہ پیچ و تاب

گر ہو سکے تو خاکِ درِ میکدہ ہو تو
اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب

آسودگانِ کُنجِ خرابات کے لئے
جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب

یا تنگ ہیں ہیا باغ نہ بو لینگے منہ سے وہ
دیگا جواب نامہ نکیرین کو جواب

رکھتا ہے چرخ اہلِ سعادت کو بدمذاق
گذران ہے ہما کی سرِ روزیٔ کلاب

دیکھے جہاں کو دیدۂ عبرت سے تو اگر
جامِ جہاں نما ہے ہر اک کاسۂ حباب

ساقی جو تجھکو عینِ عنایت سے جام دے
لے اور لگا کے آنکھوں سے پی جا اُسے شتاب

گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ
روزِ حساب تک تو پئے جا علی الحساب

مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سُنا
جامی بھی لکھے دل پہ جسے کر کے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
بعضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بطِ شراب

گلگونِ نشۂ مے گلگوں پہ ہو مرا
پابوسِ آسمان روشِ حلقۂ رکاب

مستی مری سکھائے اگر جھومنے کی طرز
ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب

بیہوشیوں میں ہیں مری وہ گرم جوشیاں
ہوتے ہیں جس سے طائرِ ہوش و خرد کباب

جاگ اُٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند
غفلت میں گر بلند ہو میری صفیرِ خواب

نہ پردۂ فلک کو اٹھا دوں اک آن میں
ہو جاؤں میں جو عالمِ مستی میں بے حجاب

ہو وہ صوابدید فلاطوں میں خم نشیں
کہہ بیٹھوں گر نشہ میں کوئی حرف ناصواب

یہ ذہن کو ہے عالمِ مستی میں روشنی
ہر خشتِ خم ہے حکمتِ اشراق کی کتاب

ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھکو شغل
ہے مثلِ شغلِ آئینہ و شغلِ آفتاب

پرہیز میرا یہ ہے کہ تقویٰ سے ہے گریز | تقویٰ ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب
لیکن ہے ابرِ رحمتِ باری سے دُرفشاں | دامانِ تر مرا روشِ دامنِ سحاب
مداح ہوں میں اُس کا کہ ہے جس کے دور میں | شیب زمانہ کے لئے کیفیتِ شباب
پیرِ فلک بنے ہے جوانِ سیاہ مست | ریشِ شعاعِ مہر پہ ہے ابر سے خضاب
مانندِ نافِ آہو اگر جام میں ہو خوں + | اُس کی شمیمِ فیض سے ہو جائے مشکناب
اُس شاہ کے نمِ کرم و بوئے خلق سے | ہر خارِ بن ہو ہمسرِ فوّارۂ گلاب
وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسم پاک | ہے درجِ زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب
ظلّ اِلٰہ ۔ خسرو دیندار ۔ دیں پناہ | شاہ بلند جاہ ۔ و خدیو فلک جناب
تیغ اُس کی وہ ظفر دم و نصرت اثر کہ ہے | گنجِ ہزار فتح کے مفتاحِ فتح باب
روشن دلی سے اُس کی عدو تیرہ بخت ہے | دزدِ سیاہ کار کو آفت ہے ماہتاب
ہو مغزِ جان کا فسرِ نعمت کے واسطے | مطبخ میں اُس کے پشۂ نمرود ہر ذباب
ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں | اُس میں ہیں دم و فورِ عطا گرمیِ عتاب
کج خلقی اس کی طبع رواں میں نہیں ذرا | دریائے موج زن کو ہزاروں ہیں پیچ و تاب
پڑھتا ہوں میں وہ مطلعِ روشن حضور میں | جس کا نہ ہووے مطلعِ خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نورِ مجسّم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو ترے سایہ سے اکتساب

تلوار تیری ہے وہ غضب برقِ کفر سوز | ہے جس کی آنچ آتشِ دوزخ کا التہاب
جوہر سے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا | سرکش کو لکھے حرف بحرف آیتِ عذاب
ق
اللہ رے پاسداریٔ اسلام و پاسِ شرع | اللہ رے تری مصلحت اللہ رے احتساب
انگور زخمِ دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے | اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب
کیسا ہی مے پرست ہو مانندِ چشمِ یار | مقدور کیا کرے قدحِ مے کا ارتکاب
بلکہ نہ لے دعاء قدح کا بھی منہ سے نام | بالغرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

شاہا تری حمایت و دولت کے سایہ میں
کنجشک رشکِ باز ہے رشکِ ہما غراب

کرتا ہے روز شب کو برابر شہنشہا
تعمیلِ عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشیدِ شیرِ چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ
چاہے ہے شیرِ جنگ یہ تجھ سے مگر خطاب

کہیئے تو تیرے تکلمِ شیریں کو شہد کیا
یہ شربتِ خضر ہے شہا وہ قئے ذباب

چالاکی ہے وہ توسنِ چالاک میں ترے
شوخی ہے چشمِ یار میں عاشق میں اضطراب

ق

کاوے ہیں یوں وہ جیسے کہ طاؤس وقتِ رقص
اڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چمکائے ایک ذرا سرِ میداں جو تو اسے
بے پر ہوا پہ جائے وہ جوں ناوکِ شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر اب اختصار
یارب دعاءِ ذوق ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عید گاہ ہو اور خطبہ و نماز
تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھکو عید ہو فتح بعز و جاہ
ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کامیاب

قصیدہ نمبر ۱۲

در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ تمیز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزمِ عماں پہ لبِ جو متبسم
تا لاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عالم یہ سردی
سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیرِ ہوا سے
کیا صرف ہوا ہے طرب وعیش سے عالم
خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور
جو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل ہیں
کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
تھا سوزنِ خار کا صحرا میں جہاں فرش
آرائشِ گلشن کے لئے جامۂ رنگیں
ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
ابرو یہ کرے قوس قزح وسمہ تو خورشید
رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا
ہوتی متحمل نہیں اک ساغرِ گل کی
اعجاز نوا سنجی مطرب سے چمن میں
حیرت سے کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر
شاہا ترے جلوہ سے ہے یہ عید کو رونق
کہتے ہیں مہِ نو جسے ابرو نے وہ تیری
پرتو سے ترے جام مئے عیش سرِ بزم
ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرۂ گردی شکل
کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں

کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی +
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی
ہے مدرسہ میں بھی سبق صرفِ ہوائی
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی
گویا کہ ہے مینائے مئے کاہ ربائی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی
سبزہ نے وہاں مخمل خوشرنگ بچھائی
زیبائشِ غنچہ کے لئے تنگ قبائی
برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی
سرخیِ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی
ہر خار کی ہے نوکِ زباں شعر نوائی
ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
کی آئنۂ چرخ میں ہے عکس نمائی
لے ساغرِ جمشید کرے کار روائی
ہو مثلِ فلک جس میں تماشائی خدائی

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جسکے
ہے بحر بھی کشتی بکفِ از بہرِ گدائی

گمرہ کو ہدایت جو ترے راہ پہ لادے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہنمائی

تا ناخنِ شمشیر نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی تری ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تیری نذر سدا نقدِ سعادت
ہے مشتریِ چرخ کی کیا نیک کمائی

ایک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نچھوڑے
گر سر بہوا ہووے ترا تیرِ ہوائی

ہر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگِ صنم میں
ہر بت میں کرے صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعرِ غزل میں ترے معنی شفا ہیں
قربان غزل کی ترے دیوانِ شفائی

مانع جو ہوا دستِ درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ
خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمون ثنا میں
ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

قصیدہ نمبر (۱۳) اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظر ثانی نہیں پائی

شاہا جمال و حسن کا تیرے لکھوں میں وصف کیا
ظاہر میں تو ظلِ خدا باطن میں تو نورِ خدا

جلوہ ترے دیدار کا ہے اس قدر بہجت فزا
روئے مقدس کو ترے جس نے کہ دیکھا یہ کہا

صل علیٰ صل علیٰ صل علیٰ صل علیٰ

انوار عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صاف
جس کی پہنچتی روشنی ہے قاف سے تا بہ قاف

خورشید مہ کو روبرو تیرے کہاں مقدورِ لاف ‏‏ ‏ کرتے ہیں دونو روز و شب آکر ترے در کا طواف

اے قبلۂ روشن دلاں اے کعبۂ اہلِ صفا

ہے تیری فرِّ دفر ہی فرِّ فریدوں کا نشاں ‏ ‏ نصفت کو تیری دیکھکر کسریٰ کی بھی ہو کسرِ شاں

تو وہ سکندر قدر ہے اے فخرِ شاہانِ جہاں ‏ ‏ تیرے ضمیرِ پاک کو پہنچے ہے جامِ جم کہاں

وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

تیری بہارِ لطف سے ہر دشت ہے رشکِ چمن ‏ ‏ پیدا ہوں خارِ خشک میں گلہائے نسرین و سمن

تیرے سحابِ فیض سے اے ظلِّ ربِّ ذو المنن ‏ ‏ جس جا کہ موجِ ریگ ہو بحرِ رواں ہو موج زن

اور دامنِ ہر موج میں لاکھوں ہوں دُرِّ بے بہا

اللہ رے دریا دلی تیری دمِ جود و کرم ‏ ‏ ہے دل ہی دل شاہنشہا تو سر سے ایکر تا قدم

آگے تری بخشش کے ہے دریا کہیں رتبہ میں کم ‏ ‏ تو بخشدے اک آن میں سو گنج دینار و درم

پیسہ بھی دیسکتا نہیں وہ فلس ماہی کے سوا

جس پر عنایت ہو تری اس کو نہیں پروائے زر ‏ ‏ جس کا کہ حامی تو ہو۔ کیوں اُس کی شکستہ ہو کمر

اللہ نے تجھکو کیا بیچارگاں کا چارہ گر ‏ ‏ اے خسروِ والا گہر تیرے تلطف کی نظر

ہے مفلسوں کو کیمیا۔ ٹوٹے دلوں کو مومیا

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسروِ والا نگاہ ‏ ‏ اب ہے دعا ذوق کی حق میں ترے شام و پگاہ

جب تک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پر مہر و ماہ ‏ ‏ فرخ ہمیشہ عید ہو تجھکو شہا باعز و جاہ

بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

تمت بالخیر

قصیدہ نمبر ١٤

مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے عالمِ ولیعہدی میں بیماری کے بعد غسل صحت کیا تھا۔ اس کی مبارک باد میں اُستاد مرحوم نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ عالمِ شباب کا کلام ہے ؏

واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا — مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار — بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دارُالشفاء
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر — شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق — لالہ بے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں — بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو — برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگِ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں — زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں — چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
نام کو اشیاء میں تلخی رہی نہ سمیّت — بن گئی تریاک افیون زہر میٹھا ہو گیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم — کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں — کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دورہ — چاہیے واقف نہ ہو دورانِ سر آسیا
ہو تیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف — آب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج — تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب — کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا
فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے — درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب — جیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدرالدجا
صبحِ صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی — لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اُس کو یکنفس فرصت نہ تھی — قرص سے خورشید کی جب تک کرلے ناشتا
رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانہ چرخِ پیر — پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
پہنچی یہ تفضیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں — لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے — جوں حباب اس کی نہیں مطلق شکم میں امتلا
ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم — جیسے الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا
ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال — ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا
رکھیگا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس — باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا
دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو — پھینکدیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا
اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج — نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا
واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو — جبکہ ہو اُس کی نویدِ غسلِ صحت جاں فزا
وہ ولیعہدِ زماں مرزا محمد بو ظفر — اس کی قوت گر ضعیفوں کو بناوے اقویا
تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد — ہوں مقوی دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا
شادی صحت ہے اُس کے آج ہو کر شاد شاد — تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا
ہیں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں — بلبلِ تصویر سنکر بول اٹھے مرحبا

مطلع

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت انتما — دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جاں بخش صحت ہے ترا ماء الحیات — جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا
ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمرِ خلق — ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آبِ بقا
قطرہ افشانی سے آبِ غسلِ صحت کے ترے — ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا
ہوں جو استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر — بخشے پیرانِ کہن کو نوجوانوں کے قوا
جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جسدم وقتِ غسل — گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا
دل عدوئے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت — زیرِ پا پامال ہونا تھا برنگِ سنگِ پا

خوردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لئے — دے گیا ابرِ بہاری نذرِ دُرِّ بے بہا
شادیِ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج — جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا
چھیڑے تارِ شمع کو گر ناخنِ موجِ نسیم — بزم میں پیدا ہو تارِ سازِ مطرب کی صدا
لب پہ ساغر کے ہے جوں موجِ تبسم موجِ مے — شورِ قلقل لب پہ ہے، مینائے مے کے قہقہا
بزم تصویراتِ فانوسِ خیالی کی طرح — حلقۂ رقاصگاں ہے زیرِ گردوں جابجا
کر رہا صحنِ چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص — آشیانہ میں ہے رقصاں طائرِ قبلہ نما
خانۂ چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے — ہے جو منظورِ نظر سب کو تماشا رقص کا
چھوٹی آتشبازی ایسی جسکی گلکاری کو دیکھ — رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا و سہا
صنعِ آتشباز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل — سنگِ پارس سے کہیں بارُوت کو پیسا تھا کیا
ہو گئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گلریز سے — ریزۂ فولاد نکلے بنکے گلہائے طلا
گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے — ماہِ پاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما
منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتابکے ہمتاب ہو — غازہ سے ہر چند چمکے رنگِ روے مہ لقا
برج جو اُڑ کر ہوئے قندیلِ شب زیرِ فلک — برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا
فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو — جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا
ہے زبانِ خامہ عاجز آگے بس تعریف میں — ذوق کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دستِ دعا
رکھے صحت سے ہمیشہ شادیِ مطلق تجھے — جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

قصیدہ نمبر ۱۵

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت معمولی کے ایک گانوُ جاگیر میں عطا ہوا تھا۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے — تھا تصوّر مرا ہر امر میں تصدیق صفت
ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھکو — تھا مرا ذہن نہ محتاج حصولِ صورت

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت

نہ غرض مجھکو نتیجہ سے نہ تھا شکل سے کام
تھی مری فکر کو ہر شکل خطا سے عصمت

ذہن میں سب مبرے حاضر صورِ علمیہ
پر جتانی مجھے منظور نہ تھی علمیت

چار و ناچار جو ترغیب سے یاروں کی کبھی
درس تدریس پہ آجاتی تھی مجھکو رغبت

کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت

کبھی منطق کو تفوق یہ مرے ناطقہ سے
تحتِ حکمت ہو یہ فن گرچہ ہے تحتِ حکمت

کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت

کبھی تقسیمِ فرائض کبھی تفہیم اصول
کبھی تعلیم عقائد بکتاب و سنّت

کبھی تھا علمِ الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت

کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانندِ حکیم
کبھی مثلِ متکلّم مجھے پاسِ ملّت

کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بحجات
اور کبھی کرتا تھا باطل بسماءِ انشقت

کبھی انکارِ قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
کبھی تکرارِ تناسخ پہ مجھے تھی حجّت

حشرِ اجساد میں تھا گاہ تردد مجھ کو
کبھی تھی عالمِ برزخ میں مجھے اک حیرت

کبھی تھی عرصۂ تدویرِ فلک کی مجھے سیر
کبھی میں ناپتا تھا سطحِ زمیں کی وسعت

کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش
کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم
کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علّت

کبھی منقول پہ مائل کبھی سوے معقول
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت

کبھی میں حافظ قرآن بعلمِ تفسیر
کبھی میں قاری قرآن بعلمِ قرأت

کبھی کرتا تھا مجسطی پہ حواشی تحریر
کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی صحت

کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیحِ لغت

کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت

گر نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے
گر جمادات کی معلوم مجھے خاصیت

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیشروی — کبھی لیجاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت
کبھی میں نفی حقائق میں تھا سوفسطائی — کبھی میں معتزلی باعثِ ردِ رویت
کبھی میں جبری و مجبور بعقل و تدبیر — کبھی میں قدری و مختار بقدرِ طاقت
گہ ملاحد کی تھی تردید کلامِ الحاد — گہ وجودی و شہودی سے بیانِ وحدت
جوں مہندس کبھی مالوف بشکل و مقدار — جوں محاسب کبھی مصروف بضرب و قسمت
کبھی حرفوں سے تھا مطلوب مثالِ جفّار — کبھی کچھ نقطہ سے مقصود تھا رمّال صفت
خانۂ کیسہ سے خارج کبھی شکلِ داخل — شکل خارج تھی کبھی داخلِ بیتِ غربت
کبھی کرتا تھا قران مہ و زہرہ پہ نظر — کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت
کبھی افسون و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم — کبھی تجویز زکوٰۃ اور کبھی قصدِ دعوت
کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے — ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت
کبھی میں رہتا تسخیری میں تھا ایسا مشغول — کہ نہ تھی ایک نفس ضبطِ نفس سے فرصت
سیمیا سے کبھی تصویر کشِ موہومات — کیمیا سے کبھی میں زرکشِ گنجِ دولت
کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس — کبھی علامہ کبھی صوفی صافی طینت
کبھی میں قربِ فرائض سے تھا عالی درجہ — کبھی میں قربِ نوافل سے تھا والا رتبت
ماہرِ موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا — کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت
کبھی میں شاعرِ غرّا و ادب دانِ بلیغ — نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت
کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ — طبعِ موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت
کبھی پیشِ نظر انجیل و زبور و توریت — کبھی مصحف میں نظر میری سرِ ہر آیت
کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے موبد — ژند و پاژند میں کرتی تھی میری تبعیت
کبھی یہ آگہی شاستر و بید پران — کروں ایک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت
کبھی میں حلِ معمّا و لغز میں ذی ہوش — کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت
آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر — عاقبت پایا انابہ کو اہلِ جنت

فائدہ کیا جو ہر ایک علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا کہ جو دیکھی کتبِ ہر مذہب
عقل سے گرچہ کیا مادہ ایسا پیدا
یا بنائی کوئی صورت کہ جسے دیکھ کے ہو
بے مقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر
پڑھوں اک مطلعِ برجستہ میں اس موقع پر

فائدہ کیا جو ہر ایک فن کی کھلی ماہیت
فائدہ کیا جو ہوئی آگہی ہر ملت
کہ بہر شکل ہو ایک تازہ محلِ صورت
ہیکلِ روم سے بتخانۂ چین تک حیرت
دور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کلفت
جس کو سن کر کہیں احسنت سب اہلِ فطنت

گر نہ دے صاحبِ جوہر کو مقدر عزت
کیا ہوا علم معقول سے اگر کیف کی ہے
قاضیِ چرخ بھی جو تو ہے تو کیا گر تیرے
دورِ گردوں نہ موافق ہو تو ہو اور خفیف
آ گئے برگشتگیٔ بخت کے چلنے کی نہیں
گو فصاحت میں تو سحبان ہے و لے بے تقدیر
گو ریاضی میں ہے صناع اگر بخت ہیں بد
کیا ہوا جانا اگر مسئلہ بیر و منار
کام تقویم نہ آئے نہ تری اصطرلاب
علم سے ہو نہ کبھی چارۂ آزارِ نصیب
سو دوائیں ترے نسخہ میں ہیں ہیچ ان بے تقدیر
علمِ نیرنج سے گو بو دے تو نخلِ نارنج
علم سے جو سبق آموزِ ملائک تھا وہ دیکھ
ہوا مسجودِ ملائک یہ ظلوم و جہول
گو تصوف سے ہو تو صوفیِ سجادہ نشیں

جو ہر فرد ہے بالفرض تو کیا بے قسمت
لیک بے یاوریِ بخت نہیں کیفیت
مثلِ دہقانِ فلک رکھتے ہوں طالعِ بخت
جرِ اثقال میں تو خفتی اٹھائے محنت
نظری و عملی کوئی بھی تیری حکمت
حرفِ مطلب پہ زباں کو ہو تری سو لکنت
نقشِ باطل ہے تری شکل وہ جس میں صنعت
پستیِ بخت سے تجھ کو جو نہیں ہے رفعت
طالعِ بد سے اگر نیک نہ آئے ساعت
بو رسینا ہے تو کیا سینہ میں خوں ہے حسرت
نہ ہو بالخاصۂ تاثیر نہ بالکیفیت
بے مقدر نہ ہو حاصل ثمرِ خوش لذت
بختِ بد سے ہوا مستوجبِ رجم و لعنت
یعنی انسان قوی بخت و ضعیف الخلقت
بے مقدر نہ کرامت ہو نہ خرقِ عادت

علم سے لاکھ ہو شیخی پر نہیں بے تقدیر
نہ کہے کوئی تجھے شیخ علیہ الرحمۃ

یہ مقالاتِ مثالِ قصصِ مصنوعہ
ہوئی یکبار جو افسانۂ خوابِ غفلت

لگ گئی آنکھ مری دیکھتا کیا خواب میں ہوں
کہ مجسم نظر آئی ہے نویدِ بہجت

اللہ اللہ رے حسن اس کا کہ سر تا بقدم
تھا وہ خالق کا تماشائے ظہورِ قدرت

یاد کرتا قدِ رعنا کو ہے اُس کے زاہد
دمِ تکبیر جو کہتا ہے سدا قد قامت

چشمِ وحشی کو اگر اپنی وہ دکھلائی تو ہو
چشمِ آہو سے ہرن نشۂ جامِ وحشت

دلِ شامت زدہ کے درپے تدبیرِ ہلاک
زلفِ واژوں تھی وہ رخسار پہ واژوں تبت

آتشِ حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی
موجۂ دودِ لطیف اس کی بھوؤں کی حالت

فوجِ مژگاں نہ بلا ہووے صف آرا تو کرے
دستِ بیداد سے یکدست دو عالم غارت

چاہِ بابل وہ ذقن اور دعواں زلف کا عکس
دل گرفتار عذاب اس میں ہے ہاروت صفت

لعلِ شیریں کی حلاوت پہ جو دے جاں عاشق
تو دمِ نزع بھی عناب کا چاہے شربت

نہ دمِ شرم تبسم سے لب اُس کے خوگر
نہ تغافل سے اُن آنکھوں کو نگہ کی عادت

کھولدے معنی معدوم کمر کی جنبش
وا کرے عقدۂ موہوم لبوں کی حرکت

شوخی و ناز کی تعریف میں اس کی مطلع
وہ پڑھوں میں کہ جسے سن کے ہو دل کو فرحت

شوخی اس چہرہ میں یوں گلمیں ہو جیسے حمرت
ناز یوں چشم میں نرگس میں ہو جیسے نکہت

لبِ پاں خوردہ کی شوخی کی ہے آگے اک بات
گر لگاوے وہ مسیحا پہ بھی خوں کی تہمت

نازک اندام وہ اور سنگدل اُن سے بھی سوا
آیا جن سنگدلوں کے لیئے ہے ثم قست

سیلی سینہ پہ تھی جعدِ پس پشت کا عکس
نظر آتا تھا صفائی سے الف کی صورت

چیں جبیں رنگ کا وہ اپنے دکھا کر عالم
ایک عالم کا ہو دل لیکے بغل میں جنت

اللہ اللہ رے تری تمکنت اف رے تمیز
واہ رے نیز انجم خنزری بل بے نخوت

قہر انداز بلا ناز قیامت طناز
سحر چشمک ستم ایما وکرشمہ آفت

جابجا عالمِ مستی میں خدم کو لغزش
آ کے اُس رشکِ مسیحا نے کہا بالیں پر
شورِ بختی سے نہ اتنا نمک افشاں ہو کہ ہو
کیا سبب ہونا کدورت سے نہیں کیوں خالی
بزمِ ہستی میں تو ہنس بول رہیگا کب تک
آتشِ دل سے ترے گوشۂ تنہائی میں
وقت ضائع نہ کر اُٹھ بسترِ اندوہ سے تو
فکرِ باطل سے نکر دل کو خنک تو اپنے
دیکھ تو کیا افقِ مشرق انوار سے ہے
ادھم لیل سرِ عرصہ ہے برگشتہ عناں
جانبِ شرق ہے نوری فلق بال کشا
چرخِ مینائی پر ایک سبز پریکا عالم
نکہتِ گل جو ہوا میں تو ہوا عطر فشاں
کھلے ہی جاتے ہیں سب غنچے زہے جوشِ نشاط
آج یہ جوش پہ ہے رحمتِ باری کہ کہیں
طفلِ نومشق کی مشقی کی طرح سو سو بار
کہے یہ رند کہ او زہد فروش آگ نہ پھانک
قل ہوا زہد کا قُلیا ہوئی زاہد کی تمام
اس قدر سازِ طرب ساز کی آواز بلند
نغمہ بر لب کہیں مطرب پسرِ زہرہ جبیں
لیکے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
چشمِ سرمست مئے ناز میں کاجل پھیلا

دمبدم نشہ صہبا سے زباں کو لکنت
لَا تَنَمْ قُمْ کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت
بادۂ میکدۂ عیش کی گم کیفیت
دل تیرا شیشۂ ساعت کی طرح کیجا عت
صورتِ شمعِ سحر سوختہ روتی صورت
بنگئی شعلۂ جوالہ کمند وحدت
چل درِ میکدہ تک ہے حرکت سے برکت
ہے تجھے مثلِ سحر ایک دو نفس کی مہلت
جلوہ افروز رخِ بانوے صبحِ عشرت
اشہبِ یوم سبک سیر ہے سوے ساحت
جانبِ غرب ہے پروازِ غرابِ ظلمت
شفقِ صبح پر ایک لال پری کی حالت
تازگی گل کو چمن میں تو چمن کو نزہت
لوٹے ہی جاتے ہیں گل بلبلے ہنسی کی شدت
نہ رہی کلفتِ عصیاں سے جہاں میں ظلمت
دھووے مستوں کے سیہ نامہ کو ابرِ رحمت
مانگے گر بادہ نو زہدِ کہن کی قیمت
سنتے ہی قلقلِ میناے شرابِ عشرت
چھیڑیں گر تارِ کھرج کا تو ہو پیدا دھیبوت
جام در دست کہیں مغبچۂ مہ طلعت
اُٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت
لبِ میگوں پہ مسی کی پڑی پھیکی رنگت

بے نمک آیا نظر حسن مہ و انجم و چرخ ۔ ہو گیا زرد رخِ شمع و چراغِ خلوت
چونکے مرغ سحری عرش سے آوازِ خروس ۔ ہو گئی خواب کو آوازۂ کوسِ رحلت
باغِ عالم میں ہیں مرغانِ ادلی اجنحہ تک ۔ مثلِ مرغانِ سحر نغمہ طرازِ عشرت
دی ہے مسجد میں مؤذن نے اذانِ نماز ۔ باوضو ہو کے نمازی نے ہے باندھی نیت
ہوئی بتخانہ سے ناقوس کی پیدا آواز ۔ چلے جمنا کو برہمن کوئی لیکر مورت
اٹھے میخوار صبوحی کے لئے لیکے سبو ۔ کہ عداوت ہے اگر کیجیے ترکِ عادت
اک طرف سے ہوئی گھڑیال کی آواز بلند ۔ ایک جانب سے لگی آنے صدائے نوبت
سحرِ عید ہے کہ عید کا سامانِ نشاط ۔ روزِ شادی کی ہے آمد شبِ غم کی رخصت
آج وہ دن ہے کہ آغوش میں لیکر تجھکو ۔ کہے طوبیٰ لک ہر شاہدِ طوبیٰ قامت
اب ہیں بیدار ترے بختِ مددگارِ نصیب ۔ اب قوی ہیں ترے طالع تری یاور قسمت
فکر کر تہنیتِ عید کا اُس شاہ کے تو ۔ دور میں جسکے ہے ہر صبح صباحِ دولت
وہ شہنشاہ بہادر رشید کسریٰ انصاف ۔ خسروِ جم خدم و داورِ دارا حشمت
قوتِ ملت و دیں قامعِ کفر و الحاد ۔ حامیِ شرعِ نبی ماحیِ شرک و بدعت
حکمِ شرعی سے کرے سلب وہ سب جذبۂ شوق ۔ مردِ مجذوب سے گر ترک ہو سترِ عورت
کون ہے اس کا نہیں وصافِ صفاتِ نیکو ۔ کون اُسکا نہیں سرگرم ثناؤ مدحت
سنتے ہی میں نے بھی وہ مطلعِ روشن لکھا ۔ مطلعِ صبح کو ہو سامنے جس کے خجلت

مصحفِ رُخ ترا اے سایۂ ربّ العزّت ۔ کھولدے معنی اتممت علیکم نعمت
تیرا دروازۂ دولت ہے مقامِ اُمّید ۔ تیرا دیوانِ عدالت ہے محلِ عبرت
تیرا احسان بہارِ چمنِ صد رونق ۔ تیری نیّت چمن آرائے ہزار امنیّت
تیرے عشرتکدہ میں بار کسے غیر نشاط ۔ تیری خلوتکدہ میں دخل کسے جز طاعت
صفحۂ علم پہ ہر جبیں سے تو ہم زانو ۔ حجلۂ عیش میں ناہید سے تو ہم صحبت

ماہ نو ایک فلک پر ترے نوبردوں میں
نو فلک نوکروں میں تیرے قدیم الخدمت

کیسۂ گوہر انجم ترا صرفِ انعام
طاقہ اطلس گردوں تیرا وقفِ خلعت

نیتِ نیک تری آئینۂ حسنِ عمل
عملِ خیر ترا جلوۂ حسنِ نیت

ذہنِ عالی ہے ترا طائرِ شاخِ سدرہ
طبعِ رنگیں تری گلچینِ ریاضِ جنت

تیرا افضال جہاں کے لئے برہانِ کرم
تیرا اکرام زمانہ کو دلیلِ رحمت

علم ظاہر سے ہے یکساں تجھے دور و نزدیک
نورِ باطن سے برابر ہے حضور و غیبت

ذہنِ صافی ہے ترا پردہ درِ معنئ غیب
موشگافی ہے تری کوہ شگافِ وقت

عقل میں شمس ہے تو علم میں کانِ گوہر
فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت

تری تدبیر پر از دفترِ ہوش و فرہنگ
تیری شمشیر پر از جوہرِ فتح و نصرت

دعوتِ صدق پہ لائے تری ایماں تصدیق
دستِ ہمت پہ کرے تیرے سخاوت بیعت

تجھسے راضی ہے خدا اور خدا کے محبوب
تیرا حامی ہے نبیؐ اور نبیؐ کی عترت

عزم کو ہے ترے ہر عزم میں عزم بالجزم
قصد کو تیرے ہے ہر قصد میں قصدِ سبقت

قوتِ روحِ ملائک چمنِ قدس میں ہو
ذات قدسی کا تری عطرِ قبائے عفت

کیا اللہ نے جب تجھ سا ولی نعمتِ خلق
کیونکہ واجب نہ خلایق پہ ہو شکرِ نعمت

نطقِ شیریں سے تری عام حلاوت ہو اگر
ثمرِ تلخ ہو حنظل کا سبوئے شربت

شوکتِ عقرب جرارہ کی مانند رہے
دل حاسد میں خلش گر ترا رشکِ شوکت

روش شیشہ ہر اک سنگ ہو ریزہ ریزہ
پڑے البرز پہ گر گرز کی تیرے ضربت

سر کشف وار چھپاتا ہے فلک زیرِ سپر
کیا غضب ہے تری شمشیر غضب کی ہیبت

آئے طوفان جو ترے قہر کا طغیانی پر
کشتی نوح بھی اعدا کو ہو گرداب صفت

وہ تری تیغ کی بُرّش ہے کہ سایہ جس کا
کردے ایکدم میں ہیولے سی مفارق صورت

تیرا بدخواہ رہے حرز سے یاں تک محروم
دیں نہ تعویذ اُسے تا بہ نشانِ تربت

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گرد زمیں
تیرے توسن کی جو کاوی کی اوڑ جائے پھرت

کیا ترے فیل کے اوصاف لکھوں ہیں کہ وہ ہے — ابر رفتار جبل پیکر و گردوں رفعت

اُس کی خرطوم ہے گر طرۂ لیلیٰ کی مثال — تو ہیں دندانِ صفا ساعد سلمیٰ کی صفت

کیا عجب گر ہو تپ لرزہ ہیبت سے تری — نبض کی طرح رگ سنگ میں پیدا سرعت

آب بارانِ کرم تیرا ہے وہ شربتِ خضر — برسے لالہ پہ تو افیوں میں نہ ہو سمیّت

عدل کے لفظ کو دیتا نہیں نقطہ کوئی — عدل سے تیرے جو موقوف ہے رسمِ رشوت

عہد میں تیرے عجب کیا سرِ داغِ دلِ شمع — شعلہ میں مرہم کافور کی ہو خاصیت

پنجۂ گربہ سرِ بچۂ موش و کنجشک — ہے حمایت سے تری دایہ کا دستِ شفقت

دورِ انصاف میں گر تیرے ہو گشتہ سیماب — تو بلا شبہ پڑے دہنی فلوس کو دیت

دیا اللہ نے وہ قلب مصفا تجھ کو — اے شہنشاہِ صفا ذہن و سراپا صفوت

فرد تفصیلِ حوائج ہے رُخ حاجتمند — عرض حاجت کی نہیں سامنے تیرے حاجت

عید کو دیکھ ترے ساتھ خلائق کا ہجوم — کہے عارف کہ یہ کثرت میں ہے ظاہر وحدت

لکھے گر خامہ ترا وصف شمیمِ اخلاق — تو ہر اک نقطہ ہو اک نافۂ مشکِ تبّت

منتہی ہوں نہ کبھو تیرے صفات نیکو — گر بیاں کیجئے تا حشر صفت بعد صفت

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن — کہ زباں کو ہے نہ یارا نہ قلم کو طاقت

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں — با شکوہ و حشم و جاہ بعمر و صحت

خیر خواہوں کے ترے چہرے پہ ہو رنگِ نشاط — اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشکِ حسرت

قطعہ در تہنیتِ جشنِ نوروز

خسروا سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز — آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تری دی ہے چمن کو جا کر — زرِ گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پا رنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج — تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرہ سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر — آگے ہمّت کے ترے گوہرِ شہوار کے گنج

حسنِ نیّت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش	دستِ حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج
نقش ہیبت پر جو ہے غالب ترا سرپنجۂ امن	فتنہ کو اٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج
نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے	ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج
تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم	صفحہ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج
لایا ہے معنیٔ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ	ذوق جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ	رنگِ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج
بزمِ رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز	اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

قصیدہ نمبر (۱۶)

سنہ ۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اُس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا تھا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر دینگے۔ ؎

مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ	ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

اسی عرصہ میں ایک دن مَیں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے انہیں ترتیب دیا تھا۔ سنائے۔ انہیں میں قطعہ پڑھا۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط	کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبریٰ	نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھئی وہ شعر؟ مَیں نے کہا۔ اب کیا ضرورت رہی آنکھیں بند کر کے فرمایا۔ یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے!

اس قصیدہ پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی عنایت فرمایا۔

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریرِ نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلیدِ قفلِ دلِ تنگ و خاطرِ دلگیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسّم کے کھول کر زنجیر

کچھ انبساطِ ہوائی چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

قفس میں بیضہ کے بھی شوقِ نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن بنالہ صفیر

اثر سے بادِ بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
نو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگِ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

نہ خارِ دشت ہے نرمی میں خوابِ مخمل ہے
ہر ایک تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دودِ گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر

یہ آیا جوش میں بارانِ رحمتِ باری
کہ سنگ سنگ میں سنگِ یدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوشاب
ہر ایک گھر گھرِ شب چراغ پُر تنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو
سوادِ مشکِ ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہالِ شمع سے ہر شب چنے گل شبّو
بہارِ عیش میں گلچیں کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگِ گلِ آفتاب ہو تغییر

لیے ہے چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش
بایں درازیٔ ریشِ آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرائشِ زمانہ سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھکے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آتی ہے نظر ایک قدرت خدائے قدیر

ظہور نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم نگہت گل اظہر و لطیف و خبیر

شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرص عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر

جہات ستّہ سے بزم جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجوم نشاط و سرور جمّ غفیر

زمانہ دشمن عشرت کا اس قدر قائل
مہ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبرے
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمین میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لائے مے سے ہو دیوار قہقہا تعمیر

دیا ہے لنج کو دھو تیرے غسل صحت نے
ضمیر خلق سے اے بادشاہ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثل نبض صحیح
کرے اگر حرکت موج چشمۂ تصویر

شہنشہا ترے یمن شفائے کامل سے
جو لاعلاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوب گل کو اگر ماریں بید مجنوں پر
ق
تو صورت بشر ہوشمند خوش تقریر

اشارۂ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیان کرے
زبان برگ سے گونگونکے خواب کی تعبیر

جو میل کحل بصارت ہو کلک خط غبار
تو چشم دائرۂ عین بھی ہو چشم بصیر

نہ موج مے کو ہو جنبش نہ شیشہ لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماری نواق و زحیر

نہ برق کو تپ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخی دارو
شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر

قوی ہے قوت تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

شکست دل کو ترے یمن تندرستی سے
ق
کرے درست اگر مومیائی تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضاء
نکالے کاسۂ چینی سے مثل موئے خمیر

کھجائے سر جو کبھی مفسدانِ سرکش کا
علاجِ خارشِ سر ہو بناخنِ شمشیر

بنا ہے نقشِ شفاخانہ ھزار شفا
ہر ایک خانۂ تعویذیہ صاحبِ تکسیر

ہر ایک اسمِ عزیمت میں اسمِ اعظم ہے
ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر

رہا نہ کوئی گرفتار رنجِ عالم میں
چھٹے جو تیرے تصدّق میں مجرمانِ اسیر

شہا ہے دم سے تیرے زندگانیٔ عالم
یہ تیرا دم ہے وہ اعجازِ عیسوی تاثیر

مثالِ خضر تو اے رہنمائے ملّت و دیں
جہاں میں پیر ہو پر ہو کرامتوں سے پیر

تو وہ ہے حامیٔ دنیا و دیں زمانہ میں
کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر

کیا شہانِ سلف نے مسخّر ایک جہاں
کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر

سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر
نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنجِ خطیر +

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر
نشانِ سجدہ ہے زیبِ جبینِ ماہِ منیر

یہ روز بہ سے ترے ہے جوانِ جہانِ کہن
کہے نہ کوئی دوشنبہ کو بھی جہاں میں پیر

حیات بخشِ جہاں تیرا مژدۂ صحت
جو بخشے خلق کو عمرِ طویل و عیشِ کثیر

ہزاروں سال سرِ ہر صدی نکال کے دانت
ہنسیں اجل پہ جوانوں کی طرح مردمِ پیر

جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت
صحیح جیسے کہ قرآں ہو مع تفسیر

یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز
ہلال نسبت و نیم کی طرح بدن کے حقیر

پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن
کہ جس کا مطلعِ خورشید بھی نہ ہو وے نظیر

مطلع

شہنشہا وہ تری روشنیٔ رائے منیر
عقولِ عشرہ کے انوار جس کے عشرِ عشیر

جو ہو نہ تابعِ امر تشاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ
تو عقلِ کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر

جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور
وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں تو یہ
نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر

جبا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ
تو ہے ضمیر کی جانب تری صفا کی ضمیر

تیرا تو سیئہ بھی یوں ہی داخلِ حسنات / کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر

کرے ہے سلبِ تغیر کو ذاتِ حادث سے / زمانہ عدل سے تیری یہ اعتدال پذیر

مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح / اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر

ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ / تو چٹکیاں دلِ آتش میں لے ہے انشگیر

ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خونریزی / لڑائیوں میں کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر

جو پہنچے بتکدہ میں تیرا شورِ دینداری / بلند نالۂ ناقوس سے بھی ہو تکبیر

کیا یہ کفر کو اسلام نے ترے معدوم / کہ کوئی زلفِ بتاں پر نہ کر سکے تکفیر

جہاں میں چشمِ سیہ مست یار کا ہو یہ رنگ / جو میکشوں کو تیرا احتساب دے تعزیر

پڑی گلے میں رسنِ خطِ سرمہ سے اسکی / رہے مدام وہ گردش میں از پئے تشہیر

وہ برقِ قہرِ خدا تیری تیغِ آتش دم / کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نارِ سعیر

جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشمِ حسود / تو ہے تفنگ کا تیرے دلِ عدو نخچیر

ترے نہیب سے ہوں شکلِ فلسِ ماہی الگ / کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر

جو تیر نکلے کماں سے تری تو ہو جاوے / طلب میں جانِ عدو کی رواں قضا کا سفیر

ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں یہ زور / ق / جو کھینچے ایک روشِ خطِ منحنی وہ لکیر

تو اس سے ایسی ہوں اشکالِ ہندسی پیدا / مٹا دے دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر

وہ روشنی ترے خط میں کہ ابنِ مقلہ اگر / ق / لگائے آنکھوں سے سرمہ کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نورِ بصارت کہ پڑھ لے حرف بحرف / جو ہووے لوحِ جبیں پر نوشتۂ تقدیر

رقم میں گر ترے اوصاف کے قصور کرے / زبانِ خامہ عطارد کی ناک میں دے تیر

تراسمند ہے وہ تیز رو کہ وقتِ خرام / ق / نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اس کا نظیر

کہ سبزگاہ ہے اس کی تو راہِ یک روزہ / اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہِ مسیر

تیرے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں / کروں حکایتِ شیریں و کوہکن تحریر

کہ فیل کوہ کجک تیشہ فیلبان فرہاد / وہ دونو دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفی آفتابِ عالم میں — خطِ شعاع سے اُس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابو ظفر شہِ والا گہر بہادر شہ — سراجِ دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

شہِ بلند نگہ شہریار والا جاہ — خدیو مہر کلہ خسرو سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع — فلک مؤیّد و اختر معین و بختِ بصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحابِ بخشش سے — تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کے بنے اکسیر

ق

بچشمِ مہر اگر تیر انیرِ اقبال — کرے نگاہ سرِ آبجو و آبِ غدیر

تو فلس فلس سے ہو ماہیوں کی قیمتِ ملک — نگینِ دستِ سلیمان بدستِ ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لئے تیرے اختتام تمام — نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوق ثنا سنج ہیچ خواں تیرا — غلامِ پیر کہن سال ایک فقیر حقیر

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ — سُنا ہے جب سے کہ رحمِ خدا ہے دعائے فقیر

الٰہی آب پہ تا ہو زمیں زمیں کو ثبات — زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تا دیر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات — زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامنگیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادرِ قیوم — بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل — سپاہ وافر و ملک وسیع و گنجِ خطیر

قصیدہ نمبر (۱۷)

ہیں میری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر — ایک گھر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا — تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو در خورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو — مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر

ہے دلِ صاف کو عزلت میں بھی گرد و غبار — گرد آلودِ یتیمی ہوا تنہا گوہر

کور باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت — کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر

غیر پر مایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس
بہگیا ژالہ ہوا لگ کے نہ پگھلا گوہر

جوہرِ خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب
خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھیرا گوہر

سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغزِ وقار
جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر

ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد
ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خارا گوہر

دلخراش اُو ہے طاقت وہ دل ہے کچھ اور
کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

فیض کو عالمِ بالا کی ہے شرط استعداد
قطرہ یکجا ہے طباشیر ہے یکجا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرطِ نظر
کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر

صاف باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو دُر
مول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی
تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

خلشِ خارِ جنوں سے ہے پرونا کیا کیا
ہر قدم پر قدمِ آبلہ فرسا گوہر

دلِ عاشق میں کرے کیونکہ نہ آنسو سوراخ
اسی الماس سے جاتا ہے یہ بیندھا گوہر

ذوق موقوف کر اندازِ غزلخوانی کو
ڈھونڈ اس بحر میں اب تو کوئی اچھا گوہر

غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر
آگے تقدیر سے خرمہرہ ملے یا گوہر

اثرِ مدح سے اُس خسروِ دریا دل کے
کر سخن قابلِ گوشِ دلِ دانا گوہر

وہ بہادر شہِ غازی کہ برنگِ نیساں
روز برسائے ہے ابرِ کرم اُس کا گوہر

جشن سے اُس کے ہے اک فیض کا دریا جاری
بہتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر

زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو
بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر

پہنچے گر گوش صدف تک یہ نویدِ عشرت
آنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر

کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی کہ اس دور میں کاش
ہوتا میں دانۂ انگور نہ ہوتا گوہر

جدولِ آب میں کثرت سے حبابوں کے بھرے
مانگ میں مثلِ بتِ خویشتن آرا گوہر

ٹوٹا ہے کشمکشِ عیش سے جو صبح کا ہار
بکھرے شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر

گلِ شگفتہ میں یہ قطرۂ باراں سے بہار
بھر دئے درجکِ یاقوت میں گویا گوہر

موج گوہر میں بھی ہے طرز تبسم پیدا
کوئی دم میں روش غنچہ ہنسے گا گوہر

رخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ
کیا تماشا ہے کہ بن جائے ہے مونگا گوہر

قطرۂ آب لطافت سا ہے ٹپکا پڑتا
گوش خوبان سمن بر میں مصفّا گوہر

مدح حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر
آج ہے خامہ مرا منہ سے اگلتا گوہر

مطلع

آج وہ دن ہے کہ اے خسرو والا گوہر
کوئی دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر

بحر و بر میں ہے شہا تیری مہیا سے نثار
سیم سے زر نمک اور لعل سے لینا گوہر

ہو تیرے فیض قدم سے جو زمیں گوہر خیز
ہو نصیب صدف نقش کف پا گوہر

مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اٹھا لایا چرخ
ٹوٹ کر جو ترے سمرن سے گرا تھا گوہر

صبح اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا
جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر

ترا آویزۂ سرپیچ کا اے قبلۂ خلق
صاف قندیل در مسجد اقصا گوہر

حلب خلق میں ہے سینہ ترا آئینہ
عدن علم میں ہے قلب مصفّا گوہر

پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابر کرم
مونیا میں عوض غنچہ ہو پیدا گوہر

ماہ گہنے کے لئے ہے نہ کہ گہنے کے لئے
تیرے کنٹھے کا کہوں کیا اسے زیبا گوہر

دُر فشانی سے تری اتنے گہر ہیں ارزاں
لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبّا گوہر

ق

عکس سے نیر اقبال کے دریا میں ترے
اے محیط کرم وجود کے یکتا گوہر

آب گوہر ہو تو آب بہ اعجاز نماء
کف دریا کو بنائے بہ بیضا گوہر

کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبت عال
گریہ من پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

طبع نازک پہ تری بار گہر ہو جو گراں
پوست بیضۂ ماہی سے ہو ہلکا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے
لگن شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر

دستِ فراش میں جاروب ہے ریشِ فرعون
فرش پہ تیلیوں میں الجھے جو صدہا گوہر

تیرے دورانِ حفاظت میں کہاں رنج و گزند
افعیٔ زلف کے کاٹے کو ہے جوں مہرۂ مار
سینہ صافی کا تری ایک ہے نقشہ دریا
نقرۂ خنگ ترا ایسا ہے رنگ شفاف
غرق دریائے جواہر میں ہے وہ کوہِ گراں
پیل تیرا ہے بلندی میں فلک سے افزوں
لیکے خرطوم میں جو آب ہو وہ قطرہ فشاں
ہے تیرے قطرۂ پیکاں سے وم بارش تیر
تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانہ کے
شعلۂ برقِ غضب ہے ترے شاہا تہِ آب
مُہرداروں میں ہے دربار کے گر نامِ عقیق
گرجے گردوں کی طرح سے وہ بآوازِ مہیب
ہو تری کلکِ کرم جبکہ شہا گوہر بار
نقطۂ قافِ قلم سے جو ہو ترے ہمسر
سینہ صافی سے تری ہووے صفا ایسی عام
ہو جو روشنگرِ عالم ترا نورِ دانش
خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف کو
ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختمِ سخن
تار ہے پنجۂ خورشید پہ ہر روز طلا
دانۂ انجمِ گردوں سے پروے جب تک
جب تلک جوشِ بہاراں سے ہوائے دمِ صبح
ہر برس جشن ترا تجھکو مبارک ہووے

حق میں بیمار کے تبخالہ ہے لب کا گوہر
گوشِ خوباں میں تہِ زلفِ سمن سا گوہر
دلِ روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر
روبرو جس کی صفائی کے ہو میلا گوہر
گل میں مہندی کے جھڑاں لعل پہنا گوہر
جھول میں جس کے ہیں انجم سے زیادہ گوہر
دیوے جوں ابر بہاراں ابھی برسا گوہر
جگر چاک عدو میں صدف آسا گوہر
مُہرۂ پشت سے دشمن کے ہے چھنتا گوہر
مثلِ مریخ ہر اک سرخ ستارہ گوہر
آبداروں میں ہے سرکار کے ادنیٰ گوہر
جوہری جسکو کہ نبلائے ہے گرجا گوہر
جیبِ محتاج کے دامن میں ہو نقطہ گوہر
قاف تک قاف سے ہو بیضۂ عنقا گوہر
دلِ کافر میں بھی ہو خالِ سویدا گوہر
موئے چینی میں پرویا کرے اعمیٰ گوہر
تو سدا اُنہ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر
تاکہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر
تا گرہ میں رکھے شب عقدِ ثریا گوہر
رشتۂ کاہکشاں میں شبِ یلدا گوہر
ٹانکے شبنم سے سرِ دامنِ صحرا گوہر
برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب — ہو نہ جز اشک سرِ دامنِ اعدا گوہر

قصیدہ نمبر (۱۸)

ہے وہ جاندار وہ مے نافع اعضاؤ حواس — کہ دلِ مردہ ہو زندہ تنِ بےحس حسّاس

قطرہ مے سے ترقیٔ حواسِ خمسہ — یوں ہو جس طرح کہ اک نقطہ سے ہوں پانچ پچاس

ہو وہ اس روغنِ کبریت سے مثلِ زرِ سرخ — رنگِ رخسار جو کلفت سے ہو ہمرنگِ نحاس

خشک مغز ونکو جو ہو بوئے گلاب اس کی بہم — تر دماغ اتنا ہو دم لینے نہ دے فرطِ عطاس

قلب ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو تو کیوں — قلبِ انسان ہیں نہ تو رسے مبدّل ہو ہراس

اُس کی دولت سے عجب کیا دلِ مفلس ہو غنی — کہ یہ ہے شربتِ دینار علاجِ افلاس

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعویٰ سے کہے — آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس

اللہ اللہ رے تری مستی و بالا دستی — شب کہے مست کہ کر لو کی گردوں سے سپاس

سلسبیل آ گئے اگر خلد سے ہو آب سبیل — کہے بیہوش کہ بجھتی ہے کوئی اس سے پیاس

زندگانی سے ہے مقصود شراب و ساقی — اور باقی تو ہے سب وہم و خیال و وسواس

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو — پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاسِ انفاس

بیٹھ گوشہ میں نہ تو چھوڑ کے اس جلسہ کو — دیکھ رندانِ خرابات نشیں کا اجلاس

مے نہیں برقعِ مینا میں مگر جلوہ فروز — کوئی خورشید نقاب ہے شفقی رنگ لباس

اے خنک دل کبھی تو اس سے ہو سرگرمِ نشاط — غم کو جا دل میں نہ دے جیکو نرکھ اپنے اداس

دل جو گھر غم کا ہو گیا اس میں سرمایۂ عیش — وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلہ میں چیل کے ماس

دلِ پُر وسوسہ کی ہوتی ہے مے سے واشد — کھلتا ہے ہاتھ سے ساقی کے یہ قفلِ وسواس

ہیں یہ کہتا ہی تھا جو دل نے مرے مجھ سے کہا — توبہ کر توبہ نہ کر اتنی زیادہ بکواس

ایسے مردار بد افعال کا تو نام نہ لے — حامیِ شرع ہے وہ بادشہِ پاک انفاس

شاہ دیندار بہادر شہِ غازی جس نے — خانۂ توبہ و تقویٰ کو کیا محکم اساس

دور میں اُس کے ہو گر مرتکب مے کوئی
کرے ہر قطرہ کلیجے میں خراشِ الماس

مے اگر آبِ بقا بھی ہو تو ہو وہ زہر آب
جس کے پینے سے ہو جینے ہی سے میخوار کو یاس

دھوئے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح
تو رہے حشر تلک شورش و درد و آماس

کہتے اس آبِ شر انگیز کو ہیں آج بشر
کہ یہ روغن ہے سرِ آتشِ شرِ خنّاس

تا نہ باقی رہے مے اور نہ مے میں مستی
توڑنا سنگِ نمک سے ہے وہ شیشہ کا گلاس

احتساب اس کا جو دے سنگ پہ شیشہ کو ٹپک
تو صدا ہو بلند اُس سے بجز حمد و سپاس

مدحِ حاضر میں پڑھوں اُس کے کوئی مطلع ہیں
کہ سخن فہم و سخنور کا ہے وہ قدر شناس +

نطقِ شیریں وہ ترا شہد کہ ہر درد کو راس
شان میں جس کے شہا فیہ شفاء النّاس

ہندوی زلف کے ہے پاس سدا مصحفِ رخ
عہد میں تیرے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

مومیائی ہو حمایت ترے حق میں اُس کے
سخت گیری سے فلک توڑے کسی کی گر آس

بوٹی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آئے
بل بے ہمّت ترے نزدیک ہے پتھر ہے وہ گھاس

چمنِ دہر میں نرگس بھی تری بخشش سے
رکھتی ایک کاسۂ زریں ہے اور اک سیمیں طاس

کیا عجب فیض ہے گر ابرِ کرم کے تیرے
بیدِ مجنوں میں ہو پیدا ثمرِ سیبِ گلاس

تیری شمشیر کے آگے نہیں رکھتی ہرگز
مغربی تیغِ مہِ نو کی شہا رتبۂ داس

فیضِ تعلیم سے تیرے ہو جو مُنکر انساں
احمق النّاس اُسے جانئے بلکہ نسناس

لوحِ تقدیر کے لکھے کو پڑھے حرف بحرف
تربیت سے ترے اُمّی بھی ہو یہ حرف شناس

یوں ترا حاسدِ پر عیب ہے عالم میں حقیر
اسپِ بد فال کوئی جیسے میانِ نخاس

دیکھے آہو کو جو ضیغم تو وہیں عدل ترا
ڈھانک دے آنکھوں کو اس کی روشِ گاوِ خراس

زہے خورشید کے طالع کہ شعاعِ خورشید
دمِ تزئین ترے گھوڑے پہ لگ جائے قطاس

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اُڑ جاتا ہے
جس طرح عاشقِ دلباختہ کے ہوش و حواس

پہنچے اس رخشِ فلک سیر زمیں پیما کو
نہ منجّم کا خیال اور نہ مہندس کا قیاس

تیرا ہاتھی ہے فلک کا کہکشاں ہے خرطوم — کان دو توامہ و خوردم ہے ذنب سرِ راس
ذنب راس جن سے ہوں سیہ بخت عدو — ماہ و خوردہ کہ ہوا خواہ ہوں روشن انفاس
رنگ ہاتھی کا سیہ اور وہ دانت اُس کے سپید — کہتا ہے دیکھکے یہ ظلمت و نور اپنا قیاس
طرفہ صنعت سے لپیٹا ہے شب یلدا نے — صفحۂ صبح منور کو مثالِ قرطاس
ختم کرتا ہے سخن ذوق دعا پر اس طرح — تا ہوں دریا میں گہر کان میں پیدا الماس

ف

توشہ بحر و برائے شاہ سکندر فر ہو — دے خدا عمرِ خضر تجھکو حیاتِ الیاس
عید ہر سال ہو فرخ تجھے با عیش و نشاط — تو ہمیشہ رہے خوش اور ترا بدخواہ اداس

قصیدہ نمبر (۱۹)

ایک خورشید لقا طرفہ جوانِ اشق — تا بہ رخسارِ فلق سرخی رخسارِ شفق
وہ جبیں ماہ مبیں اُسپہ خطِ چین جبیں — تھی وہ انگشت نبی جس نے کیا ماہ کو شق
کرے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابرو تلوار — باندھ کر کھینچ لے دل زلفِ مسلسل کی دہق
تیر انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گذار — چشمِ ابلق تو نگہ ترک سوارِ ابلق
غمزہ و ناز کرشمہ وہ بلا غارت گر — کہ نہ چھوڑیں تنِ عشاق میں جاں ایک رمق
سرو قامت سمن اندام گلستاں رخسار — ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق
شرقامت سے اگر اُس کے ہو طوبیٰ سرکش — راست ہاں راست ہے یہ کُل طویلٍ احمق
شکر آمیختہ با دام مقشر دنداں — سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق
کھلنا اُسکے دہن تنگ کا ایسا مشکل — جیسے دشوار ہو مفہوم کلامِ مغلق
مصحفِ روئے کتابی کو جو دیکھو اُس کے — تو کہیں صورتِ اخلاص نہ یادِ مطلق
لوحِ رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاضِ گردن — تا کہ ہو سرخی شنجرف نہ خونِ ناحق +
دست و بازو و برو دوش عجب صبح لقا — پنجہ و پنجۂ خورشید و حنا رنگ شفق
سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا — ناف ایک عکسِ دہن اسمیں بجائے زورق

نازک ایسی کمر اس کی کہ سمجھنا مشکل
جس طرح شعر خیالی میں ہوں معنیٔ ادق

ہے گراں اس پہ نزاکت سے نہ باندھے ہرگز
گر ہو تارِ نظر دیدۂ عنقا منطق

اُس کا زانو وہ مصفا کہ اگر دیکھے اُسے
آئینہ آبِ خجالت میں رہے مستغرق

کیا کہوں ساقِ بلوریں کی صفائی اُسکی
شمع گر دیکھے اُسے شرم سے آجائے عرق

قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن
نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق

آکے بالیں پہ وہ طنّاز سراپا انداز
مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگین ناحق

مژدۂ عید سے ہے گلشنِ عالم میں بہار
نغمہ عیش سے ہے بزم جہاں میں رونق

دوش پر سرو لب جو کی ہے اک سبز قبا
بر میں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں یلیق

جوشِ سبزہ سے ہے وہ فرش سرِ صحنِ چمن
کوئی مخمل اسے کہتا ہے کوئی استبرق

باغِ عالم میں ہے یہ جوشِ بہارِ عشرت
ٹپکے ہے نخل سے مستی میں ہمیشہ راوق

تو بھی کر تہنیتِ عید کا اُس کے ساماں
کہ ہے وہ خسروِ دیں حامیٔ دینِ برحق

وہ بہادر شہ غازی کہ دمِ معرکہ ہوں
اُس کے تیروں کی ہدف اُسکے حسودوں کی حدق

مدح اُسکی ہے مناسب تجھے بلکہ انسب
یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق

سن کے یہ میں نے کہا مدح میں اُسکے مطلع
جسپہ احسنت کہیں مجھ کو لبید و عمعق

تو ہے وہ نائبِ ختمِ رسل اے سایۂ حق
کہ ترے سایہ میں ہے گلشنِ دیں کو رونق

ابرِ رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق
کیونکہ سایہ میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق

کس کا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو
جو ترا امر ہے الحق جو کہے تو صدّق

ذکرِ حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور
کرتا میخانہ میں ہے شیشۂ مے بھی حق حق

گر کرے نشو و نما نامیہ فیض ترا
گل جو ہو شمع سے پیدا تو گلاب زنبق

حرف ہیبت کا تری کوئی زباں پر آیا
ہو گئی وقتِ کتابت جو زبانِ خامہ کی شق

نطقِ شیریں سے ترے ہووے حلاوت گر عام	کام میں خلق کے پورا ہو بجائے بورق

ناتوانوں کو جو دے زورِ حمایت تیری	مارے لات اُڑ کے سرِ پیل دماں بچۂ بق

کہتے ہیں برق جہاں جسکو وہ ہے ایک ادنیٰ	توپخانہ میں ترے توپ پہ زریں بیرق

کونہی جس پہ کرے کاہکشاں کی بھی کمند	تری ہمت عالی کا ہے عالی جوسق

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحابِ ہمت	بوٹی اکسیر کی پیدا ہو بجائے سرمق

کرتا اونٹے کو جو اعلیٰ نہ تیرا منصوبہ	پاتا شطرنج میں فرزیں کا نہ رتبہ بیدق

کرتا اک جست میں ہے ماہیِ گردوں کا شکار	طائرِ تیر ہوائی ترا مثلِ لقلق

ق

اے شہِ دادگر اے خسروِ انصاف پرست	اللہ اللہ رے عدالت کا تری نظم و نسق

اتنا عالم میں حذر خوں سے ہے خونخواروں کو	خونِ فاسد کو بھی ہرگز نہ کرے نوش علق

پرتو افگن ہو اگر روشنیِ طبع تری	ابرق آئینہ ہو اور سنگِ سیہ ہو ابرق

مشتری بھی ترے شطرنج کا اک مہرہ ہے	آفتاب ایک ترے گنجفہ کا گر ہے ورق

ق

ابر ہے گرچہ مثالِ سمندِ سمندیدہ	گر تری برقِ غضب جھاڑ دے اُس پر چقماق

تو شتابہ سے بھی جل اٹھے زیادہ وہ شتاب	آگ لگ جانے میں دیر اُس کے نہووے مطلق

ق

تیرے توسن میں وہ جلدی کہ اگر چھیڑ دے تو	یوں وہ اُڑ جائے کہ جیسے سرِ آتش زیبق

شمس گو پہنچے تری راہ سے یوں شرق میں نور	تو ہو مغرب ہیں گراہے پر تو نورِ مطلق

جس طرح روشنیِ قلب سے اہلِ اشراق	عرصۂ دو سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق

ق

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح	تا کہ ہوں ارض و سما دو نو طبق زیر طبق

ہووے ہر سال مبارک تجھے عیدِ رمضاں	اور دشمن کو یہ ہے تیرے سدا رنج و قلق

قصیدہ نمبر (۲۰)

ایک دن فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سالِ جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے دل نے کہا کہ قصیدہ لکھئے اور ایسا لکھئے کہ اُستاد

بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا - یہ طرح خدا نے دی اور خود سرانجام کیا - اللہ اللہ ان دنوں کا جوشِ طبع بھی یاد رہیگا - عجب عالم تھا ؎

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوشِ نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن میں گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیبِ چمن شانِ چمن
ہر سیمبر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوشِ بہار و موجِ گل
دندانِ پانخوردہ ہیں یا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر مجمعِ پیر و جواں ایک طرفۂ مشرق ہے کہ واں
روشن دل و رنگیں ادا نورِ سحر رنگِ شفق

جامِ بلوریں میں ہے یوں عکسِ شرابِ لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

حسنِ گلِ مہتاب نے جوشِ گلِ سیراب نے
کیا باغ میں چمکا دیا نورِ سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگِ گل آلودۂ شبنم جو کل
خجلت سے پانی ہو گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی
کس رنگ ہوں ملکر جدا نورِ سحر رنگِ شفق

ساقی مئے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر
آب و ہوا کے فضا نورِ سحر رنگِ شفق

جشنِ بہادر شاہ ہے روز علو جاہ ہے
ہے اس لئے بہجت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ خسروِ روشن گہر جس کو خجل ہوں دیکھ کر
ماہ و ثریا و سہا نورِ سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں اور وہ ثنا سے رنگ دوں
ہوں دیکھ کر غرق حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق
ذرہ ہے تیرے فیض کا نورِ سحر رنگِ شفق

اے آفتابِ عز و شاں تیری جبیں سے ہے عیاں
نورِ یقیں رنگِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روشن بیانی ہے تری رنگیں کلامی سے تری
شرمندہ ہوتا ہے سدا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ سیمگوں ایواں تراوہ سائباں رنگیں ترا
لیں دام اب جس سے صفا نورِ سحر رنگِ شفق

فانوسِ شیشہ لعلگوں روشن تری محفل میں یوں
گویا کہ شیشہ میں بھرا نورِ سحر رنگِ شفق

انصاف نے تیرے شہا سیماب آتش کو کیا — یوں جمع جیسے ایکجا نورِ سحر رنگِ شفق
تیری امان و حفظ سے ہو جاے حق میں شمع کے — نارِ خلیل آبِ بقا نورِ سحر رنگِ شفق
خورشید تجھ سے فیض کو پہنچے تو مشرق میں نعم — جز درّ و لعلِ بے بہا نورِ سحر رنگِ شفق
جس پر کہ تو ہووے غضب ہو اُسکے حق میں کیا عجب — سیلِ فنا برقِ بلا نورِ سحر رنگِ شفق
شمشیر کی تیری چمک خونِ عدو سے یک بیک — دکھلائے ہے روزِ وغا نورِ سحر رنگِ شفق
پیکانِ تیر الماسگوں منہ سرخ سوفاروں سے یوں — گویا لگا کر پر اُڑا نورِ سحر رنگِ شفق
جلوہ ہے تیری مہر کا شعلہ ہے تیرے قہر کا — ہے جسکو عالم جانتا نورِ سحر رنگِ شفق
اسپِ حنابستہ ترا وہ نقرہ خنگِ بادپا — غیرت سے جس کے اڑ گیا نورِ سحر رنگِ شفق
اب ذوق کی ہے یہ دعا جب تک رہے شاہنشہا ق — خورشید و ماہ ارض و سما نورِ سحر رنگِ شفق
جب تک لباسِ مہر کو صابون اور شنجرف ہو — زینت دہِ صبح و مسا نورِ سحر رنگِ شفق
ہر جشنِ فرّخ ہو تجھے اس طرح آب و تاب سے — ہوں تیرے محتاجِ ضیا نورِ سحر رنگِ شفق
شاہا زمانہ میں ہوتا با آبرو اور سرخ رو — ہو جلوہ گر مشرق سے تا نورِ سحر رنگِ شفق
دشمن کا تیرے منہ ہو فق اور خون بھی دل ہو کے شق — دیکھے نہ وہ اس کے سوا نورِ سحر رنگِ شفق

قصیدہ نمبر (۲۱)

طرب فزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ — دیکھ کر بھاگے جسے رنج ہزاروں فرسنگ
بلبلے بالیدگیٔ عیش کہ برگِ گل پر — قطرۂ شبنم کا ہے مینائے شرابِ گلرنگ
واہ کیا گلشنِ آفاق میں ہے جوشِ بہار — چہچہے کرنے لگی بلبلِ تصویرِ فرنگ
کلکِ نقاشیِ قدرت سے گلستاں میں ہے آج — تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقشِ ارژنگ
خسروا آج کیا تو نے وہ جشنِ نوروز — دیکھ کر جس کے تجمل کو ہو جمشید بھی دنگ
ہے ترے بزمِ طرب میں پئے رسمِ نوروز — صورتِ بیضۂ رنگیں فلکِ مینا رنگ
مشک افشاں ہو جہاں میں جو تری نکہتِ خلق — نافِ آہوئے ختن سے نہ ہو کم داغِ پلنگ

بلکہ ہو جوشِ بہاران کرم سے تیرے — کیا عجب شاخ میں آہو کے گلِ زنگار رنگ

تیرے انصاف سے ہے بزمِ جہاں میں شاہا — شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ

ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتشِ قہر — تو سمندر رہے پانی میں بجائے خرچنگ

ق

زیرِ ران تیری ہے وہ توسنِ چالاک کہ تو — چھیڑ دے ایک ذرا اس کو جو وقتِ صفِ جنگ

یوں کرے جست کہ جیسے سرِ میدانِ نبرد — منہ سے اُڑ جا حریفوں کے ترے خوف سے رنگ

رکھتی سرعت ہے تپِ لرزہ ہیبت سے ترے — نبضِ محموم کی مانند جبل میں رگِ سنگ

مرغِ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ — اور جگہ چوبِ قفس کے ہے ترا تیرِ خدنگ

ہووے حاسد کو نہ آزارِ حسد سے صحت — تا کہ دارو نہ پیالے میں بھرے تیری تفنگ

مفسد و حاسد و غماز و عدوئے سرکش — زیرِ شمشیرِ غضب تیرے ہوں چاروں چورنگ

آ نہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام — ہوتا ہے قافیہ سنجوں کا یہاں قافیہ تنگ

ق

کرتا اس رنگ سے ہے ختمِ سخن دیکے دعا — ذوق جو ہے ترا مداحِ محبِ یکرنگ

گلشنِ دہر میں ہر سال مبارک تجھ کو — جشنِ نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ

اور ترے حاسدِ بد میں کو دکھائیں لاکھوں
خسروا روز نئے رنگ فلک کے نیرنگ

قصیدہ نمبر (۲۲)

حبذا ساقیِ فرخ رخ و خورشید جمال — مرحبا مطربِ ہاروت فن و زہرہ خصال

بارک اللہ کہ دُر افشاں ہے تو اے ابرِ بہار — خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے بادِ شمال

للہ الحمد لبالب ہے مئے عیش سے جام — شکر للہ زرِ گل سے ہے چمن مالا مال

جوشِ روئیدگیِ سبزہ سے ہو جائیگا سبز — گل زمیں چمنِ حسن میں تا دانۂ خال

اللہ اللہ رے سرسبزیِ گلزارِ جہاں — کیا عجب ہے روشِ خضر اگر رنگِ بلال

شررِ تیشۂ فرہاد سے پیدا ہوئے گل — بل بے جوشِ گلِ خودرو سرِ دامانِ خیال

جوشش فوارہ ہے ہاں کثرتِ تارِ بارش — سرِ مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال
کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ باراں — ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آبِ زلال
معجز باد سے مانندِ عصائے موسیٰ — شجرِ خشک بھی ہو جاے تر و تازہ نہال
ذوقِ مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص — شوقِ آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال
شورِ بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل — بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال
دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیتِ مے — اس ہوا میں ہے بطِ مے کا اُڑون بے پر و بال
ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفیِ صافی مشرب — رقصِ مستاں میں ہے وجد کناں شاملِ حال
بیدموں کو جو نفسے چارہ گرِ عیسیٰ دم — شمعِ مردہ کی رگِ تار سے کھولیں قیفال
پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز — جنبشِ دستِ مژہ دے ہے اسی انداز سے تال
ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار — صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گردِ ملال
روز جشن آج ہے اُس کا کہ جسے کہتی ہے خلق — نائبِ ختمِ رسل ظلِ خدائے متعال
وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اُس کی — اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جاے ہلال
وہ نکوخوے و نکوروے و خجستہ منظر — وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال
وہ مسیحا دم و یوسف رخ و داؤد الحان — وہ سلیماں حشم و موسیٰ کف و صالح اعمال
چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخاء — چشمۂ فضل و ہنر کانِ عطا بحرِ نوال
آسمان جاہ و عطارد قلم و مہرِ علم — مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال
خسرو جم حشم و داورِ کسریٰ انصاف — شاہ دارا دل و سلطان سکندر اقبال
مدح حاضر میں پڑھوں اسکے وہ مطلع جس سے — ہمسری کی نہ رکھے مطلعِ خورشید مجال

ہو تری یک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال
مہر سے گر مہِ کامل ہو دو ہفتہ میں ہلال

نیر جاہ ترا وہ جسے تا دورِ فلک — نہ کسوف و نہ غروب نہ ہبوط و نہ وبال
آگے بخشش کے ترے خرمنِ دریک دانہ — آگے ہمت کے ترے کوہِ طلا یک مثقال

ہووے جوں چادرِ مہتاب گلیمِ شب تار — رخِ پرنور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلّق ہی رہا — دستگیری نے لیا تیری جو گرنے کو سنبھال

گر ترے قہر کی گرمی سے تپ محرق بن جائے — لبِ دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال

قوتِ ماسکہ ممسک کے قویٰ سے گم ہو — فیضِ جاری سے ترے بخل کو یا تنگ ہے زوال

حکمت آموز ترا علم جہاں ہے تو وہاں — نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطوں کو مجال

ہو تری عقل سے عاجز دمِ بحثِ معقول — اک مقولہ میں فقط فعل کی عقلِ فعّال

دم ہے کیا بادِ صبا میں کہ دمِ سیر جہاں — ق — تیرے گلگونِ سبک سیر کے جاوے دنبال

یونہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے — اور پہنچ جائے کہیں سے وہ کہیں مثلِ خیال

ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری — ہے اوڑان اس میں ملک کے تو بشر کیسے خیال

جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اس کا — عہدِ مستقبل و ماضی کا وہاں ہے یک حال

زیبِ تن اسکے جو مہندی کا ہر گل تصویر — پھرنا کا وے ہیں ہے وہ صورتِ فانوسِ خیال

اس فلک سیر کو جولاں جو کرے تو تو یہ ڈر — مزرعِ سبزِ فلک ہو نہ مبادا پامال

تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ — ق — سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال

کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے — نیشکر راہ میں مانگیں اگر اس سے اطفال

جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں — اسکی مستک پہ شہا جلوہ نما یوں ہے ڈھال

ہے جو اس فیل کی خرطوم سرافیل کا صور — آئے اعدا پہ قیامت سرِ میدانِ قتال

اسکے دانت انکے لئے ہیں روشِ تیرِ شہاب — ہے جن اعدا کو سرِ اوجِ شیاطیں کی مثال

آبداری میں تری تیغ کہ ہے برق کی موج — ق — کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش بہ بال

تیری شمشیر کو ہے خونِ عدو روز مباح — یہ غلط تیسرے دن ہوتا ہے مردار حلال

طائرِ روحِ عدو کے لئے صیّادِ اجل — سبزۂ تیغ میں جوہر سے لگا رکھتا ہے جال

طاقتِ دم زدن اس دو زباں ہے کس کو رہی — دیکھکر تیر انسق اے شہِ فرخندہ خصال

پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس — لب پر آجاے ہے سینہ سے پئے استقبال

ہو قوی دست اگر زورِ حمایت سے ترے
شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگانِ غزال

تقویت دیوے اگر پاسِ حفاظت تیرا
شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنہ سے زمانہ خالی
فیلسوفی ہے حکیموں کی خلا کہنا محال

آتش و آب میں ربط ترے عدل سے ہے
دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

ق

کاکلِ موج و خاں کے لئے اُس کے دریا
لے تہِ آب سے شانہ پرِ ماہی کا نکال

خبرِ جملۂ عشرت ہے ترا جشنِ سعید
بلند اجس کا شہا غرۂ ماہِ شوّال

ہوتی ہے جبرتِ توصیف سے تیری شاہا
روشِ غنچۂ تصویر زباں مُنہ میں لال

ق

بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے
یہ جو ہے ذوقِ ثنا خواں ترا اور مدح سگال

جشنِ ہر سال ترا ہووے مُبارک تجھکو
رہے جب تک کہ زمانہ میں حسابِ مہ و سال

قصیدہ نمبر (۲۳)

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخِ محیل
واہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل

دُرِ زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا
لاکھ بہروپیوں سے جسکی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار
کہ بجز حفظ خدا جس کی نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی
زنگ دیتا ہے چھپا جوہرِ شمشیر اصیل

پیشِ دشمن نہ گذر حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتش نمرود گلستانِ خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں بے قید علایق کسی عالم میں بزرگ
رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل

ہے نہ خاک بھی قاروں کو سفر حشر تلک
نہیں تا تختِ ثریٰ منزلِ آرام بخیل

عید یکروز جہاں میں رمضاں ہے یکماہ
بعد ہے کثرتِ تکلیف کی یاں عیشِ قلیل

کشتِ سبزِ فلک دوں سے نہ رکھ چشمِ ثمر
خوشۂ فیض سے بے بہرہ ہے یہ مزرعۂ نیل

قابل انسان کی صحبت کے ہے انسان نہ ملک
بنگیا پیشِ نبیؐ صورتِ دحیا جبریلؑ

جتنا خورشید تپے اُتنی ہی بارش ہو سوا
ہووے کیونکر تپشِ عشق نہ رحمت کی دلیل

عشق کھنچوائے ہے اک اژدہا کش سے بزور
بارِ صد کوہِ الم بے عملِ جرِّ ثقیل

لگی نہ چرخ کو گر نالۂ عاشق کی ہوا
دم میں اجزائے دخانی کی طرح ہوں تحلیل

شمع کشتہ کے لئے ہے دمِ عیسیٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

معتبر ہے جو کرے نالۂ دل دردِ اظہار
نالہ ہے دل کی زباں دل ہے موکل کا وکیل

دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری
جس کا اجمال قضا اور قدر ہے تفصیل

جی میں ہے اُس کو پڑھوں میں کوئی مطلع ایسا
گوہرِ مخزنِ معنی سے ہو جس کو تاویل

کنجِ حیرت میں کروں علمِ خموشی تحصیل
یہ عجب مدرسہ ہے جس میں ہے قال نہ قیل

درسِ توحید سے لوں ایک شفا کا نسخہ
بحث میں علّت و معلول کی ہے عقلِ علیل

جلوہ افروزی یک بدرِ دجیٰ ہے اُس کو
شمع فانوس سمجھ خواہ چراغِ قندیل

ق

فکرِ بیہودہ میں کس واسطے ہے تو پابند
کچھ نکال اپنے لئے ذوق نکلنے کی سبیل

خوابِ غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
نہیں مہتاب یہ ہے روشنی صبحِ رحیل

عرصۂ عمر ہے وہ تار کھنچا اور ٹوٹا
کچھ اگر وقتِ معیّن کی طرف سے ہو ڈھیل

وہی منزل ہے جہاں ٹھہرے حیاتِ گذراں
کہ پئے راہِ فنا کوئی نہ فرسخ ہے نہ میل

مشقِ اندوہ سے اک روز نہیں تجھ کو بیکار
تیرے ہفتہ میں نہیں کوئی بھی روزِ تعطیل

غمِ عصیاں ہے تو ہے رحمتِ غفّار وسیع
فکرِ روزی ہے تو ہے رزق کا رزّاق کفیل

ہے تمنائے زر و مال تو سب جائیگا چھوڑ
چھوڑ جانے کو تو کافی ہے فقط ذکرِ جمیل

پھر بہارِ چمنِ عمر میں دلگیر ہے کیوں
سیر کر سیر کہ ہے فرصتِ گلگشت قلیل

مژدۂ عید سے ہے دیکھ تو کیا رنگِ چمن
گل کی رنگیں ہے قبا غنچہ کی رنگیں مندیل

ہوئے آراستہ ہیں آج بدل کر پوشاک
فصل سے باغ تلک باغ سے لے تا بہ نخیل

نظر آتا ہے بہ رنگِ لبِ ساغر جو ہلال
ٹپکا پڑتا ہے لبِ مست سے شوقِ تقبیل

گاہ مے خم میں ہے گہ شیشہ میں کیا کیا پے سیر
روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

تہنیت خواں ہو تو آج اس شہ دریا دل کا
جسکے نزدیک ہے اک قطرہ سے کم قلزم و نیل

وہ بہادر شہ والا نسب و پاک گہر
خسرو چرخ سریر و شہ خورشید اکلیل

ماہِ نو چشم زدن میں مہِ کامل ہو جائے
نظرِ مہر میں ہے اس کے وہ نور تکمیل

نورِ معنی ہے بہر شکل نتیجہ اس کا
اللہ اللہ رے زہے شکل شہنشاہ شکیل

مدح حاضر میں پڑھوں مطلع روشن ایسا
مطلع شمس کو بھی جسکے ہو واجب تبخیل

بعد شاہان سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے قرآں پسِ توریت و زبور و انجیل

تو ہے اس طرح سے عزت دہِ اولادِ تمر
جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

نور افزائے بصارت ہو اگر تیرا جمال
آئیں آنکھوں سے نظر معنی اللہ جمیل

روئے نیکو پہ ہے مائل تیری خوئے نیکو
کہوں کیونکر نہ کہ اَلحُسنُ اِلَی الحُسنِ یمیل

ہے جو انسان کے قالب میں ترا نور ظہور
برج خاکی میں ہے خورشید فلک کی تحویل

دانش آموز ہو گر تربیت عام تری
بید مجنوں کو بنا دے ابھی انسانِ عقیل

جوہرِ تیغِ اجل ایک ترے حکم کی نقل
تیر حکمی قضا حکم کی تیری تعمیل

عہد میں تیرے جو ہو راہِ تعدّی مسدود
کھلے فعل متعدّی سے نہ باب تفعیل

تشنۂ ذوق حلاوت ہوں نہ کیونکر سیراب
تیری شیریں سخنی ہے انہیں شربت کی سبیل

نکتہ چینوں کے لئے نکتۂ برجستہ ترا
قابضِ طبع رواں ہے روشِ دانۂ بہیل

جب عدو کی غارِ ہوا تیرے نشان بندوق
نسرِ طائر کو بھی تو سمجھے ایک اڑتی ہوئی چیل

مہرۂ پشت عدو میں تیرا تیرِ صف دوز
رشتۂ مہرۂ تسبیح کی مانند دخیل

طائرِ روح عدو کے لئے بہرِ پرواز
تیر کی تیری صدا جیسے کبوتر کو زفیل

وہ قیامت ہے تری فوج کہ شورِ محشر ق
دم نہ مارے کبھی سن پائے جو گھوڑوں کی صہیل

نالۂ بوق کی ہیبت سے رکھے پھونک کے پاؤں
کوچۂ صور سے گزرے جو دم اسرافیل

دوں تیرے گھوڑے کو کیونکر میں پری سے نسبت
نہ بہ صورت نہ یہ رفتار نہ یہ ڈول نہ ڈیل

گرم جولاں وہ کہاں ہو کہ رکھے ہے وسعت
نہ تو میدانِ تصور نہ فضائے تخییل

عرصۂ معرکہ میں گر تجھے اے شاہسوار
اس سبکسیر سے منظور ہو کارِ تعجیل

جائے یوں جیسے ہوا سیم بلخی پانی سے ہو تر
نہ ہو پروا اُسے ہے راہ میں تالاب کہ جھیل

ق
کوہ البرز کو سائے میں دبالے اپنے
ہے وہ اے شاہ فلک رتبہ تری رفعتِ فیل

حملہ آور ہو وہ جسدم تو پٹے جان عدو
اُس کی خرطوم ہو دستِ کششِ عزرائیل

ق
تو جو محراب عماری میں ہوا جلوہ نما
اُسکے دانتوں پہ یہ خرطوم سے سوجھے تمثیل

خانۂ قوس میں خورشیدِ جہانتاب آیا
دن ہیں کوتاہ ہوگئے اور ہوئی رات طویل

نہیں یہ جوشِ گل و لالہ نکل آیا ہے
دادخواہی کے لئے خاک سے خونِ ہابیل

عدل نے تیرے کیا روئے زمیں کو گلزار
آج تک عدل میں کوئی نہ رہا تیرا عدیل

واسطے دیدۂ بدبیں کے ہے یہ عین صلاح
ہو نزی نوک سناں سرمہ کو ریکھے جو میل

تیر برسائے عدو پر جو کماندارِ قضا
کم نہ فوارہ سے ہو تیروں کی اُسکی قندیل

رہزنِ نطفۂ بدخواہ ہوا دل سے قضا
اُس کی پشتِ پدری سے نہ کبھی تا احلیل

محکمہ میں تیرے انصاف کے ہوں ہاتھ قلم
دے اگر بھول کے بھی کوئی سرِ حرف کو چھیل

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
ہو گرانِ خاطرِ نازک پہ مبادا تطویل

عید ہر سال ہو فرخ تجھے با جاہ و جلال
ہوں قوی پایہ تیرے دوست بصد رنگِ جلیل

جو ضلالت سے ہوں گمراہ وہ اے ظلِ خدا
ذل اقدام سے ہوں خاک مذلت پہ ذلیل

قصیدہ نمبر ۲۴

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاط طرب سے لبالب آج
ایک غم سے پڑا اُٹھا نہیں ساغر آسماں

دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہاں میں
گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں

اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب اگر
شادی کی اُس کی دھوم ہے آج آسماں تلک
فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
ہے اسکی بارگاہ میں مانند چوبدار
اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر سرور
بھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کے ہو کم
تو روکی بخت مطبخ عالی میں اس قدر
اس روشنی کی چند دکھا دیجے پنچیاں
ابرِ بہار دودِ چراغاں سے تو بتو
چشمِ قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند
کر ڈالے پارہ پارہ فلیتوں کے واسطے
یہ کہنہ و سیاہ دو وہ خوشرنگ و نو بہ نو
ٹھلیوں میں ہیں وہ نقل پڑے انکا عکس اگر
آرایش ایسی اور وہ گلہائے رنگ رنگ
بنوائے اسمیں پھول طلائی و نقرئی
نقارخانہ کی ہے چراغاں سے وہ شکوہ
کرتا ہے رقص تخت پہ نقارہ خانہ کی
آوازۂ دمامۂ نوبت سے گونج اُٹھا
دولہا دلہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی
جائے عجب نہیں ہے کہ عطرِ سہاگ کے

سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں
مثلِ حباب جامہ سے ہو باہر آسماں
تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں
تسلیم کو ہے جس کے جھکاتا سر آسماں
حاضر عصائے کاہکشاں لیکر آسماں
ہے پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں
مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں
ہے جسکا ایک تودۂ خاکستر آسماں
نازاں ہے آفتاب کے پنجہ پر آسماں
ہوں سات آسماں کی جگہ ستر آسماں
کاجل لگائے اُسکے دھوئیں سے گر آسماں
مہتاب کو سمجھ کے کہیں چادر آسماں
فائق ہو کیا سبوچہ ساچق پر آسماں
لے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں
ادنیٰ سا جنمیں غنچۂ نیلوفر آسماں
لے لیکے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں
گویا ہے اک زمیں پہ پُر از اختر آسماں
ق شہنائی کی صدا کو جو سُن سُن کر آسماں
وہ جو سب آسمانوں کے ہے اوپر آسماں
آیا ہے ایک سہاگ پڑا بنکر آسماں
شیشہ کے شیشہ بھر کے لڑھادے گر آسماں

یارب ہمیشہ دولہا دلہن میں رہے سہاگ
جبتک کہ ہووے نیچے زمیں اوپر آسماں

مہندی کے وصف لکھنے کے قابل نہیں یہ ہے
نیلا سا ایک کاغذ بے مسطر آسماں

جو برج اڑتے ہے اڑکے یہ ہوتا ہے وہ بلند
رکھ لے ہے سر پہ مثل گل احمر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جا ہے صبح تلک گوہر آسماں

پہنچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

عیش و طرب کو مژدہ کہ کرتا جہاں میں ہے
زہرہ سے اب قران مہ انور آسماں

ہنگام بزم عقد ستاروں کے واسطے
کیا کیا سجے ہے اوج و شرف کے گھر آسماں

بدبیں کے ہے نظر کے جلانے کے واسطے
انجم سپند آگ شفق مجمر آسماں

جسوقت سہرہ باندھ کے دولہ ہوا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں

کرتا تھا ان یکاد کو دم پڑھ کے دمبدم
دولہا کے صبحدم رخ روشن پر آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخل آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخ خشک تمنا کو نخل سبز
درپردہ مثل پردۂ بازی گر آسماں

شادی کا اس کے نور بصر کے ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طواف در آسماں

وہ شاہ نامور کہ بہادر شہ اس کا نام
ہو حکم سے نہ اس کے کبھی باہر آسماں

وہ آفتابی اس کی تجمل جس سے آفتاب
وہ چتر اس کا جس سے نہ ہو ہمسر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے
مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں +
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں

تو آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں

خطبہ کے واسطے ترے نام بلند کے
گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسماں

وہ بحر بیکراں ہے تری ہمت وسیع
ہے بلبلا سا ایک کنارے پر آسماں

دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا
بہ جائے مثلِ کشتیِ بے لنگر آسماں

قد پہ ترے ہو راست قبائے علوِ جاہ
زیبندہ جس کے واسطے بالا بر آسماں

تیری گہرفشانیٔ دستِ کرم سے ہے
گویا کہ ایک دامن پر گوہر آسماں

چمکائے تیغ تیز کو اقبال گر ترا
ہو مصقلہ ہلال تو صیقل گر آسماں

یوں دل میں تیرے جلوۂ ذاتِ محیطِ حق
آ جائے جیسے آئینہ کے اندر آسماں

سرعت میں تیرا رخشِ فلک سیر کیا شہاب
رفعت میں بھی ہے ہیل جبل پیکر آسماں

شاہا عجب نہیں ترے شبدیز کے لیے
بنوائے ماہِ نو سے رکابِ زر آسماں

پہنچا نہ اُس کے کاوے کے انداز کو کبھی
کھاتا رہا زمیں پہ سدا چکر آسماں

انجم ہیں کیا شرر ترے نعلِ سمند کے
ہے بلکہ تیرا گردِ رہِ لشکر آسماں

ق

مانا اگر بلندیٔ شان و شکوہ میں
ہاتھی سے تیرے ہو بھی گیا ہمسر آسماں

پر اُس کے نقشِ پا کے مقابل بنا سکے
چار آفتاب ایک جگہ کیونکر آسماں

یہ ذوق کی دعا ہے کہ جبتک زمانہ میں
منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسماں

بزمِ نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز
لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں

مارے جگر میں حاسدِ بدخواہ کے ترے
تارِ خطوطِ مہر سے نشتر آسماں

اشعارِ تاریخ دیوانِ نواب الٰہی بخش خاں معروف

سبزہ زنگاں کہ بباغِ حسنند
تازہ چوں شاخِ گل و لالہ و ورد

از کمر تا دہنِ شاں موہوم
چوں خطِ جوہریٔ جوہرِ فرد

چشم دارند بقتلِ عشاق
چوں حریفے کہ کند قصدِ نبرد

بجمالِ رخِ آنہا معروف
تا گفتے شد کہ دلش خوش میکرد

رفت صحبت سخنش از دہلی
تا عنادِ اہلِ عراق و ماوردِ

[illegible]

واندراں حال سخنہا میگفت
ہمہ چوں نالۂ موزوں پُر درد
صد و یک مطلع نرگس آخر
گفت با نالۂ گرم و دم سرد
شد چو تسبیح زمرّد نامش
رونق و آب گہر رفت بگرد
مُرد فیروزہ خوں شد دل لعل
کہربا چوں یرقانی شدہ زرد
پیش آں گنج گہر نیست چو خاک
گنج خسرو کہ بود باد آورد
ذوق چوں خواست دو تاریخش را
اندریں دفتر معنی بد و فرد
اوّل از دانۂ خوشرنگ شمار
کرد و آں عقدۂ مطلب وا کرد

باز با خامۂ رنگیں بنوشت +
طرفہ تسبیح زمرد آورد +

قطعہ تاریخ تعمیر چاہ معمرہ محمد شاہ سہارنپوری

سید با صفا محمد شاہ
کرد تعمیر طرفہ مسجد و چاہ
ذوق تاریخ سال ہر دو ہم
زد رقم ساخت کعبہ و زمزم

خسروا نیرّ اقبال کی تیرے خورشید
کھائے ہے وقت شرف عزو شرف کی سوگند
تاب کیا انجم سعادت سے ترے ہو ہمسر
منزل اوج پہ چمکے مہ تاباں ہر چند
دم تحویل یہ کہتے ہیں عناصر چاروں
چار چند آپ کا ہو مرتبہ بلکہ صد چند
پرورش امن کے سایہ میں کیا کرتا ہے
شیر نر بچۂ آہو کو بجائے فرزند
قصر دولت سے ترے مرغ نظر ریختہ پر
بام حشمت پہ ترے کاہکشاں نصف کمند

قصیدہ مسدس دعائیہ

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو

سرِ ہفت آسماں جبتک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو

رہے نامِ سلیماں تانگیں حکمرانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے

رہے نامِ فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے

ترا اے خسروِ والا حشم عالم مسخر ہو
سریرِ سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخارِ ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
زمیں میں تا ہو کاں اور کاں میں ہو جوہر کانی

رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
پئے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحرِ پُرگہر ہو کانِ پُرزر ہو

رکھیں تا عود کو آتش میں اور آتش کو مجمر میں
رہے نافہ میں مشک اذفر اور بو مشک اذفر میں

گلِ تر تا ہو گلداں میں تجھے ہو تا گلِ تر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں

ترے ابرِ کرم سے باغِ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریقِ رہبری میں خضرؑ ہو جبتک ہدایت فن
رہے ادریسؑ تا قطعِ تعلق سے جناں مسکن

سہارا ہووے تا بحرِ غریقِ الیاسؑ کا دامن
مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن

چراغِ عمر سے تیری جہاں سارا منور ہو
فروغِ اسلام کو ہو رونقِ دینِ پیمبرؐ ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو

کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
کرے وسمہ سے تا قوسِ قزح سبز اپنے ابرو کو

لبِ پانخوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیری انگشتِ سناں پر ہو

گلستاں میں ہو تا گُل اور گُل سے شاخ ہو برپا
نہالِ تاک میں انگور رہو انگور میں صہبا

نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نشہ صہبا میں نغمہ اور ہو نشہ جھنبک نشاط افزا

شرابِ عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشنِ جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محرابِ عبادت سے

خوشی تا حاجیونکو ہووے کعبہ کی زیارت سے
نماز اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیبِ منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر رہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آئیں
زباں پر تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں

قلمزن تا ہو مشک افشاں و کاغذ خط سے مشک آگیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہلِ سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسروا ذوق سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعاگو ہو ثناگر ہو

اشعار متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ

قطعہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے
قصدِ صید افگنی کیا جس دم

خونِ نخچیر سے ہؤا سارا
دامنِ دشت لالہ زار ارم

نہ بچا اُس شکار افگن سے
صید کوئی سوائے صیدِ حرم

مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ
ہوئے مسکن پذیر دشتِ عدم

ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ
ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم

سمجھے شیر آپ کو ھزار غنیم
اُس کے پر سامنے ہے مثلِ غنم

شیرِ گردوں بھی اس کے لشکر میں
پائے ہرگز نہ غذر شیر علم

رہے مانندِ شیرِ قالیں کے
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے
کیئے شیرِ ژیاں شکار کئی
ہے بجا گر دلاورانِ جہاں
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو
تا رہے یادگار عالم میں

اوجِ ہمّت سے اُس کے زیرِ قدم
ہمسر اژدہائے آتش دم
اُس غضنفر شکار نے پیہم
کھائیں اُس کی دلاوری کی قسم
چاہا اس طرح دل نے کیجے رقم
وصفِ عالیٔ صاحبِ عالم

لکھی اے ذوق میں نے یہ توصیف
مع تاریخ ثانیٔ رستم
۱۲۶۲ھ

لکھتے ہیں کس کی تہنیت عید مدح خواں
آراستہ ہوا جو قلمدان آسماں

عہد میں تیرے نکالے دانت گر سینِ ستم
کام لے زنبور کا خامہ سے دستِ معدلت

گر پڑے پاؤں پہ تیرے مہر آ کر سایہ دار
آفتابی سے جو تو کہدے کہ اس کو روک ست

فصل گل آج ہے وہ سلطنت آرائے طرب
کہ ملا باغ میں بلبل کو ہزاری منصب

ہے اگر لیلی سیاہی تو ورق عذرا عذار
خط ترا شیریں ہے شاہا اور قلم شاخِ نبات

ہو گیا خورشید مالا مال وہ ہیں نور سے
دی جو تُو نے دولتِ انوارِ دانش کی زکوٰت

ہاتھ میں بندوق لے جس وقت تو بہرِ شکار
شیرِ گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیرے نجات

پر نہیں پر ترا توسن وہ پری سان پرّاں
سیر گہ جس کے ہے اک قاف سے لیکر تا قاف

ہو قوی دست ترے زور سے اسلام اگر
کھینچے شمشیر سرِ کفر پہ پھر مرکز کاف

پاشا گرداب سے ہے گردہ نان آبی
تیری بخشش سے جو دریا کا معین ہے کفاف

دستِ ہمت نے ترے کھوئی روپے کی جو قدر	چٹکیوں میں ہیں اُڑاتے اُسے کیا کیا صرّاف
دیتا ہے تیری فوج میں نقارہ جب فلک	آتا ہے صاف چوب کی صورت نظر ہلال
تا نسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے	منظور تجھ کو جب کہ شکار پرند ہو

مطلع قصیدہ مدح حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنّت آرامگاہ

قصیدہ مرقومۃ الذیل آغاز شباب کا تھا۔ والد مرحوم نے ایّام جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ استاد مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔ یہ چند اشعار یادگار رہے۔ اللہ۔ ع۔ تو باقی و یادگار باقی :

آج کچھ ایسی ہوائے عیش کی تاثیر ہے	ہر ورق کاغذ کا رشکِ گلشنِ کشمیر ہے
گر نہالِ دشت کو شوق حنا بندی نہیں	ہاتھ کیوں میدھی سے رنگتا برگِ بید انجیر ہے
مدح حاضر میں سنا دے مطلع روشن کہ ذوق	منتظر مشرق میں بیٹھا مہر پر تنویر ہے
نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے	ہر اذاں میں شامل اور داخل ہر تکبیر ہے

بادشاہی قصّہ خوانوں میں میر امیر علی نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ اُنہوں نے استاد مرحوم سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہدیجئے کہ داستان میں جب ایسا موقعہ آتا ہے۔ تو اشعار حسب دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے۔ استاد مرحوم نے حسب عادت وعدہ کر لیا مگر پورا کرنے کی فرصت کہاں۔ جب کئی تقاضے گذر گئے۔ اور اُنہوں نے پھر کہا تو ایک دن فرمایا کہ جب ہم بادشاہ کے لئے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا۔ اُس میں طبیعت پر ذرا زور ڈال کر کہینگے۔ تمہارا کام ہو جائیگا۔ ہمارے قصیدہ کا ایک جزو ہو جائیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا ÷

قصیدہ مذکور معدوم ہو گیا - غدر کے بعد عالم تباہی میں ایکدن میر موصوف حافظ ویران کو مل گئے - حافظ کو اللہ مغفرت کرے اُن سے اشعار مفصلہ ذیل حاصل کیئے - اور مجھے دئے - تین شعر متفرق اور بھی ہیں وہ بھی لکھتا ہوں ٭

کروں رقم اگر تہنیت کا میں آہنگ
تو ہووے خامہ سے پیدا صدائے رباب و چنگ

ہے تا زورِ حمایت کہ پانوں کو اپنے
کرے ہے شیر کی چربی سے مالش آہوئے لنگ

شہا ترے رخِ روشن کو کس سے دوں تشبیہ
کہ مہر و مہ کو گہن لازم آئینہ کو زنگ

گھوڑے کی تعریف میں

کروں میں کیا ترے گلگوں کا وصف چالاکی
اُڑا ہی جاتا ہے وہ تو برنگ طائرِ رنگ

نہ پہنچے گرد کو اُس کے وہ پیکِ فکر رسا
کہ ہووے عرصۂ چرخ جسکی ایک شلنگ

چلے ہے یوں کج و واکج ادا و ناز کے ساتھ
کہ جیسے مست مئے ناز کوئی دلبر شنگ

وہ چلنے میں ہے تذرو اور اُڑنے میں شاہیں
اُچکنے میں ہے وہ آہو لپکنے میں ہے پلنگ

نہیں پری وہ پری سے ہے سوا پرّاں
نہیں وہ آدمی لیکن سب آدمی کے ڈھنگ

رواں ہو گر وہ سبک سیر آب دریا پر
تو سُم بھی تر نہ ہو اُس کا چہ جائے زانو و تنگ

جو چھیڑے اُسکو تو میداں میں اور کہیں اُسکے
بزیرِ نعل سُم آکر شرر فشاں ہو سنگ

شرارِ سنگِ نظر سے نہاں نہ ہونے پائے
ڈپٹ کے اور وہ پھر آئے سینکڑوں فرسنگ

اگر ہو تجھکو شہا اُس کے خانہ زیں میں
تمام عرصۂ گیتی کی سیر کا آہنگ

تو اس ارادہ کے آنے میں تا ٹک ہو دیر
اور اس کے جاکے پھر آنے میں کچھ نہ ہووے درنگ

ہیں وہ نعلین خسروا ترے سراورنگ گل
جن پہ کھاتا ہے چمن میں تختہ اورنگ گل

کرے ہے مہرِ علی دل کو صفا پُر انوار
طلوعِ شمس پہ موقوف ہے وجود نہار

علیؑ سے کیونکہ نہ ہو زیر لشکر کفّار
علیؑ ہے شکل جلی اور علیؑ ہے حرف چار

مخمس در مدح

خسروا چڑھ کے سر گنبد دوار ھلال
حاضر خدمت عالی ہے بہر کار ھلال
خود لب عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ھلال
گرز بردار ہے خورشید کماندار ھلال
آسماں لیکے سپر چلتا ہے تلوار ھلال

دست ہمت ترا خورشید سے ہے بالاتر
آئیں تیرے در دولت پہ گدایانہ اگر
تری بخشش سے ہے نیساں عرق شرم میں تر
اپنے کاسہ میں بھرے چرخ وہیں لعل و گہر
اور کشتی میں بھرے درہم و دینار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دولتخواہ
عید ہر سال ہو فرخ تجھے باحشمت و جاہ
اور جو حاسد ہیں تیرے واسطے اُن کی ہر راہ
چرخ پر تیز کرے خنجر خونخوار ھلال

قصیدۂ ناتمام در منقبت

لکھوں جو میں کوئی مضمون ظلم چرخ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں
یہ حال ہے مرا ضعف دماغ سے کہ مجھے
صدائے صور قیامت ہے ہر مگس کی طنیں
زمانہ عربدہ پرداز و بخت بدناساز
ستارہ برسر پرخاش و چرخ برسر کیں
عجب نہیں ہے کہ راہب خط چلیپا سے
بناوے تیرے طویلہ کے واسطے خرزیں

رباعیات مدح

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز
ہو شرف اندوز ترے طالع سے
فرخ ہو سدا جہاں میں جشن نوروز
ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

خورشید سے یکروز جہاں ہیں نوروز
اور تجھ سے جہاں روز مسرت اندوز
ہے تجھکو زمانہ ہیں شرف دوازدہ ماہ
اور ہے مہر جہانتاب کو یکماہ یکروز

کہتا ہے یہ فیروزئے رنگ نوروز
تو ہو صف اعدا پہ مظفر فیروز
ہو دشمن سرکش کے لئے سہم الموت
اے شاہ عدو کش ترا تیر دل دوز

دعا ہے ذوق کی ہو خلعت ولیعہدی
مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
بحق سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

اشعار قصیدہ

آگے تیری طبع موزوں کے ہے اک فعل عبث
یہ جو کرتے ہیں عروضی فاعلاتن فاعلات
فیض سے تیرے نہ کیونکر اک جہاں سرسبز ہو
ذات ہے تیری شہا سرچشمۂ آبحیات

اشعار قصیدہ ہفتدہ زبان

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن
جوش روئیدگی سبزہ یہ یاد آئی ہے
اُنْتَ اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتًا حَسَنًا
جس طرح شعلہ کا عالم ہو بفانوس خیال
خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیر کفن

شاہا یہ عمر و دولت و اقبال و عزّ و جاہ
فرخ یہ تجھ کو سالگرہ ہو ہزار سال
بلکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز
ہوں جس میں بے شمار گرہ بے شمار سال

کوہ اور آندھی میں ہیں گر آتش و آب خاک و باد
چل نہ سکینگے آج پر آتش و آب خاک و باد
تا کہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست یوں باز
چھوڑ دیں ترک پوجنا آتش و آب خاک و باد

نثر موزون

حمد سے آغاز تھا شکر پر انجام ہے کہ فرض نے اپنا حق ادا کیا - اور عمروں کی آرزو آج پوری ہوئی - قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکان تک بارہا چڑھتا اور اُترتا رہا - ۱۰ مہینے کے بعد قلمدان میں آکر دم لیا ہے - اس میں اتنی طاقت کہاں تھی - پاک نیّت کا زور تھا - اور صدقِ عقیدت نے پر پرواز لگائے کہ یہ رُتبے پائے - استاد کے کلام شاگرد کے لئے حقیقی اور تحقیقی بھائی ہوتے ہیں - اَب اُن سے رخصت کا وقت ہے - ہاں برادرانِ عزیز ایک حساب سے دو پشت - اور دلی سے نکل کر ۲۴ برس ہم تم ساتھ رہے - پریشانی اور سرگردانی حد سے گذری - مگر رفاقتوں میں فرق نہیں آیا - پیارے بھائیو اللہ نے تمہیں ہیئتِ مجموعی دی ہے - آج تک میرے پاس امن و عافیت کے دامن میں سوئے - اب اکیلے نکلتے ہو - اور آزادی کے زور سے اٹھتے ہو - رواج کے پروں سے اُڑو - عالم کی وسعت میں پھیلو - شہرت کے شہروں میں پھرو - وقت کی درازی میں عمر پاؤ - لو اللہ تمہارا نگہبان ہے - تم بھی مجھے خدا حافظ کہو - پیارے بھائیو دیکھنا - دیکھنا - دنیا ایک مقام ہے - بچ کر چلنا - دشمنوں کا شمار نہیں - اور دوست اللہ ہی اللہ ہے - یا اللہ بد نگاہوں سے بچائیو - اور بدی کے قلموں کو توڑ یو ؂

بے بس آزاد - بیکس آزاد اس وقت ایک عالم میں بیٹھا ہے

کس کا دل ہو کہ اس کیفیت کو پائیے۔ نیک اُستاد۔ پیارے اُستاد کے لکھے۔ پھٹے پرانے کاغذ۔ پرزے سامنے پھیلے ہیں۔ یہ لڑکپن سے لے کر جوانی۔ اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے۔ یہ درست ہے کہ گراں سنگ قرض تھا۔ اور گراں بہا فرض تھا۔ جس سے آج میں ہلکا ہوا۔ لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور ۱۰ مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے۔ ہائے! دلگیر محنت تھی لیکن دلپذیر محنت تھی۔ سخت کام تھا۔ مگر مزے کا کام تھا۔ اور ثواب پر انجام تھا۔ کہ اُستاد کا کلام تھا۔ اب یہ کام کہاں آہ اُستاد کہاں اُستاد۔ خیر آزاد! بہارِ زندگی کے لطف ہوتے ہیں۔ کہ بہارِ نظر اور سماعت۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک ایک کر کے انسان سے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ تب وہ کیا کرتا ہے۔ صبر کرتا ہے۔ بس صبر کر۔ کہ یہ نعمت بھی رخصت ہوئی۔ اور نہ کروگے تو کیا کروگے۔ بندگی کا عالم بے چارگی کا عالم ہے۔

خاتمہ تحریر اس دعا پر ہے کہ الٰہی تو جانتا ہے۔ آزاد نے جو کچھ کیا۔ نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے۔ اور تیرے حکم سے کیا ہے۔ اس خدمت کو قبول کر۔ کلام کو عمر دے۔ نام کو روشن کر۔ اور آزاد کے حال پر رحم کر کہ تو ارحم الراحمین ہے۔

تمت بالخیر

نیرنگِ خیال

مع ازدیادِ مضمون نظم اُردو

بظاہر ایک خیالی تصویر ہے۔ مگر دوراندیشی کی آنکھ سے زمانہ اور اہلِ زمانہ کو جس نظم ونثر کی ضرورت ہے۔ اسکا جگہ جگہ پرواز بتایا گیا ہے۔ اندرسبھا اور چہار درویش جیسے افسانوں کو طاق پر رکھ کر ملٹن اور شکسپیئر کے کلام کا انداز۔ کالیداس کے ترانے متقدمین شعرائے اردو کے تخیلات کا بین فرق ثابت کرتا ہے کہ نظم ہو یا نثر اسے تشبیہ اور استعاروں سے برہنہ کرکے اگر دیکھا جائے تو استخوان ہندی ہیں مفید اور کارآمد مغز ہونا چاہئے جامعیت کی علیحدگی کے بعد نتیجہ خیز مادہ ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بے کار ہے تحصیل لاحاصل ہے۔ اور ایسی نثر کی اب ضرورت نہیں جو تکمیل مطالب سے قاصر ہو۔ تمثیلاً مغربی زبان کے جواب مضمون (Essay) پیش کرکے شعرا اور اہلِ قلم کو ہدایتیں ہیں کہ مشرقی زبان اردو کے مالک بن کر مغربی خزانوں پر بھی متصرف ہوں۔ اور دونوں زبانوں کے تجربے سے ایک ایسا سمویا ہوا دریا بہائیں جس سے ملک سیراب ہو اور زبان کا خزانہ مالا مال ہو جائے۔ ان تمام مطالب کو مولینا نے نظم کے بدلے نثر کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ نیرنگِ خیال کے تخیل اور نثر نظم کو ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے۔ اس سے بہتر کوئی کتاب زبان اردو کے پاس نہیں جو نثر کے عجائب خانہ میں رکھی جائے باایں ہمہ ایسی عدیم المثال مشعلِ ہدایت کی قیمت صرف ۸؍

نصیحت کا کرن پھول } اس روشن خیالی کی چمک دمک میں بھی ظاہر ہے کہ ملک کی آبادی کا نصف حصہ یعنی مخدراتِ عصمت اُس وقت تک تاریکی میں ہیں جس کا درد رکھتے ہوئے مولینا آزاد نے 'نصیحت کا کرن پھول' تعلیم نسواں کے واسطے ایک دلچسپ فسانہ کے طور پر ایک میاں بیوی کی بحث نہایت نتیجہ خیز پیرایہ میں لکھا ہے کہ ہونہار کونپلوں کی نشو و نما کے لیے ایک بہترین ریویو نہایت ہے جس میں آسان اردو سیدھے سادے فقرے روزمرہ کی بول چال اور لڑکیوں کی خاصی دلبستگی کا سامان ہے۔ قیمت صرف ۸؍

سخندانِ فارس

(یعنی)

زبانِ فارسی کی جامع اور مکمّل تاریخ

ژند - پہلوی - دری اور سنسکرت کے ہم معنی الفاظ کا تقابل پیدا کر کے نامور مُصنّف نے زبان فارسی کی ایک مکمّل تاریخ بہم پہنچائی ہے جسکی ترتیب میں پندرہ سال کامل محنت شاقہ اُٹھانی پڑی ہے ؛

قوموں کے باہمی تعلقات اور زبانوں کے میل جول سے مٹے ہوئے سراغوں کی کھوج لگا کر اصل و فرع تغیّر و تبدّل کو صاف ظاہر کر دیا ہے - براعظم ایشیا کے دو بڑے خطوں ایران اور ہندوستان کے رسم و رواج کا مقابلہ کرتے ہوئے مصنّف ممدُوح نے جگہ جگہ اپنی سیاحتِ ایران کے چشم دید حالات بھی موتی کی طرح ٹانک دیئے ہیں - جن سے پہلی دنیا آج کل کی روشنی سے ٹکراتی ہے ؛

زبانِ فارسی کی تاریخ

اس سے بہتر دستیاب نہیں ہوسکتی - گویا علم کے دریا بہا دئے ہیں - مشاہیر کے نظم و نثر کلام کا حوالہ دیکر مابہ الامتیاز فرق دکھایا ہے - سخندانِ فارس کا ایک مختصر سا رسالہ مطبع رفاہ عام میں چھپا تھا - وہ اس کا ابتدائی حصّہ تھا - اب کامل و مکمل ۳۰۰ صفحوں پر ۲۰ × ۲۶ تقطیع نہایت خوش خط سفید ولایتی کاغذ پر آزاد بک ڈپو نے چھاپا ہے - بایں ہمہ قیمت فقط عہ ؛

المشتہر

آغا محمد طاہر مینجر آزاد بک ڈپو - اکبری منڈی - لاہور

نگارستانِ فارس

سخندانِ فارس کے بعد مولینا نے ادبِ فارس کو اس آویزہ جواہر سے
سجانا چاہا تھا۔ مگر افسوس عالمِ بیخودی نے یارا نہ دیا۔ اب
خوش قسمتی سے بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد آنکھیں کھولیں
اور ایک پرانے دقیانوسی بستے میں سے یہ لعلِ بے بہا
جوں کا توں نکل آیا۔ نگارستانِ فارس کیا ہے؟ بس یوں
کہئے کہ فارسی زبان کے مشاہیر کو آبِ حیات پلایا ہے اور

نگارستانِ فارس

یعنی فارسی مشاہیر کا تذکرہ اور زبانِ فارسی کی عہد بعہد کی
ترقیوں کو ان کے کلام کے ساتھ ساتھ شورخانہ شان کے
ساتھ آبِ حیات کے لفظوں میں ادا کیا ہے۔ ندائے سخن
استاد رودکی سے لیکر خانِ آرزو تک کے حالات سے نگارستان
کو سجایا ہے۔ پھر مولینا کی زبان سے نکلے ہوئے نقد کیا ہیں
شرارے ہیں۔ پھول جھڑتے ہیں۔ تقریباً حجم بھی آبِ حیات
کے برابر ہوگا۔ کتابت شروع ہے۔ کارڈ بھیجکر نام درج رجسٹر
کرائیں تاکہ تیار ہوتے ہی فوراً آپ سب سے پہلے اپنی
آنکھوں کو مولینا کی نئی تصنیف سے روشن کریں۔
قیمت بہت واجبی ہوگی +